رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

جلد ۵۹، عدد ۲ نومبر ۱۹۶۲ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفترِ رسالہ ترجمان القرآن

۵- اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

نشری تقریریں

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

یہ مولانا مودودی کی اُن غیر مطبوعہ تقاریر کا مجموعہ ہے جو انھوں نے تقسیم سے قبل اور بعد آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کی تھیں۔ ان تقاریر میں مختصر مگر جامع اور دلنشین انداز میں اہم موضوعات پر اسلام کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ درحقیقت کوزہ میں دریا بند ہے۔ پہلی بار کتابی شکل میں شائع کی جا رہی ہیں۔

خوبصورت سرورق — عمدہ کتابت — نفیس طباعت

آپ کی لائبریری کی زینت بننے کے قابل

ضخامت ۱۲۸ صفحات * قیمت (سستا ایڈیشن) ۱/۲۵ مجلد -/۲ روپے

اپنا آرڈر جلد بک کرائیے مبادا یہ ایڈیشن جلد ختم ہو جائے اور آپ کو دوسرے ایڈیشن کا طویل انتظار کرنا پڑے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۱۱۔سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۹	نومبر ۱۹۶۲ء	عدد ۲

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ - لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

مارشل لا کے اٹھنے کے بعد اگست کے ترجمان القرآن میں ہم نے ملت اسلامیہ کے سامنے اس دعوت کا تعارف کروایا تھا جس کی سربلندی کے لیے جماعت اسلامی پھر منظم ہو کر جدوجہد کر رہی ہے۔ ان گزارشات کے آخر میں ہم نے کارکنوں کی خدمت میں یہ گذارش کی تھی کہ اس دعوت کے اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے افکار و نظریات، اپنے کردار اور باہمی تعلقات کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ اور اپنی پوری زندگی کو اسی ایک رنگ میں رنگ لیں جسے قرآن مجید نے صبغۃ اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس ضمن میں ہم نے دو بنیادی صفات کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی تھی، توکل و استقامت اور دعوت کے برحق ہونے پر مکمل یقین و اعتماد۔ ان صفحات میں ہم اسی سلسلہ کے تحت چند اور معروضات پیش کرتے ہیں۔

اس دعوتِ اسلامی سے کسی کارکن کا تعلق کسی دفتری نوعیت کا نہ ہونا چاہیے کہ ایک آدمی مجبور ہو کر محض حالات کے دباؤ کے تحت بالکل بے بسی کے عالم میں اپنے اوپر ایک بوجھ لاد رہا ہے۔ اسلام کے ساتھ ایک مسلمان کا رشتہ ایک "اضطراری تعلق" کا نہیں بلکہ محبت اور اخلاص کا رشتہ ہے۔ ایک شخص اگر اس کے ساتھ وابستگی میں ہی اپنی اور بنی نوع انسان کی دنیاوی اور اُخروی سمجھتا ہے تو وہ بطیبِ خاطر خود آگے بڑھ کر اس کی غلامی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لے اور اگر اس کے دل و دماغ اس پر مطمئن نہیں ہیں بلکہ اس کے نزدیک فلاح و کامرانی کے کچھ دوسرے گُر اور کچھ دوسرے ہتھکنڈے ہیں تو اسے پہلے انہیں آزما لینا چاہیے۔ اسلام کو

ایک "ناگزیر بوجھ" سمجھ کر نہ اٹھانے سے وہ مقصد پورا نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لیے اسلام دنیا میں آیا ہے۔ ایمان اور اعتقاد کا تعلق انسان کے دل و دماغ سے ہے اور یہ حیاتِ انسانی کے دو ایسے گوشے ہیں جن میں کسی قسم کا کوئی جبر و اکراہ نہیں پا سکتا۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ط وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔ (البقرہ ۔ ۲۵۶)

دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت تو گمراہی سے صاف صاف کھل چکی ہے۔ تو جو کوئی طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے اُس نے ایک بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جس کے لیے کوئی شکستگی نہیں اور اللہ بڑا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اس آیت سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ دین کا اصلاً تعلق چونکہ عقیدۂ قلب سے ہے اور قلب پر جبر و اکراہ کی گنجائش ہی نہیں لہٰذا ایمان کا تعلق اپنے ارادہ و اختیار سے ہے، جبر و اضطرار سے نہیں۔

پھر اسی حقیقت کو دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔

سو آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ لوگ ایماندار نہ ہونگے جب تک کہ یہ لوگ اس جھگڑے میں جو ان کے آپس میں ہیں آپ کو حکم نہ بنالیں اور جو فیصلہ آپ صادر فرمائیں اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اسے پورا پورا تسلیم کریں۔

ایمان کے دو اجزا ہیں پہلا جزو یہ ہے کہ ایک آدمی حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے جملہ معاملات کا حکم بنائے کیونکہ حضور کے فیصلے ہی ہر لحاظ سے برحق اور مبنی بر انصاف ہیں۔ دوسرے حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی انتہائی ضروری

ہے کہ حضورؐ کے فیصلے سُن کر انسان اپنے اندر کسی قسم کی دل گرفتگی محسوس نہ کرے۔ یہی کیفیت درحقیقت اُس کے ایمان کی اصل شہادت ہے۔ چنانچہ فقہائے امت نے اس آیت سے استنباط کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو کوئی اللہ یا اُس کے رسول کے کسی حکم میں شک وشبہ کرے یا ماننے سے انکار کرے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے[1]۔

ایمان جبر واکراہ نہیں، بلکہ تسلیم ورضا کا دوسرا نام ہے۔ انسان کے قلب میں یہ جڑ پکڑتا ہے، شعور و وجدان کے صاف اور شفاف چشمے اس کی آبیاری کرتے ہیں۔ اخلاص اور محبت کی فضا اُسے پروان چڑھاتی ہے اور عمل پیہم، ایثار اور قربانی سے اسے قوت وطاقت حاصل ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے ایمان کی اسی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ	ایمان والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور
إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ	رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے
بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا	مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ	اطاعت کی، ایسے لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔

"سمع واطاعت"، ہی درحقیقت ایمان کا اصل جوہر ہے اور اسی بنیاد پر اسلام کی رفیع الشان عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ	اللہ کے لیے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور
وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ	جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو چھپاؤ یا

[1] وفی هذه الآية دلالة على ان من ردّ شيئاً من اوامر الله تعالىٰ واوامر رسول الله صلى الله عليه وسلم فهو خارج من الاسلام سواء ردّه من جهة الشك فيه او من جهة ترك القبول والامتناع من التسليم۔ (احكام القرآن، جصاص)

يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۔ ظاہر کرو اللہ اُس کا حساب لیگا

تو یہ بات حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کے رفقاء کار پر کچھ گراں سی گزری۔ وہ آپ کے پاس آئے، اور آپ کی خدمتِ اقدس میں دوزانو ہو کر بیٹھ گئے اور بارگاہ نبوی میں عرض کی، یا رسول اللہ ہم پر وہ اعمال لازم کیے گئے تھے جن کی ہم میں طاقت اور قوت تھی مثلاً نماز، روزہ، جہاد صدقہ اور اب یہ آیت نازل ہوئی ہے جس کے ہم اپنے آپ کو متحمل نہیں پاتے۔ اس پر حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: کیا تم اہل کتاب کی طرح یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔ تم تو یہ کہو: ہم نے سنا اور اطاعت کی۔" (صحیح مسلم)

اس "سمع و اطاعت" کے لیے ایک مسلمان کے اندر جتنی تڑپ موجود ہوگی اتنا ہی اُس کا ایمان مضبوط ہوگا۔ اسی ایک فرض کی ادائگی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے جلیل القدر صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے ہر قسم کے مصائب اور شدائد کا بڑی بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن اُن کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہ پیدا ہوئی۔ بلکہ اس سمع و اطاعت اور تسلیم و رضا کے واقعات کا جب ہم آج بھی مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بسا اوقات حیرت ہونے لگتی ہے اور ہم سوچتے ہیں کہ آخر وہ کونسی روحانی لذت تھی جس کے حصول کے لیے حضور کے جاں نثاروں نے خود آگے بڑھ کر نہایت ہی والہانہ انداز میں جان جان آفریں کے حوالہ کی لیکن دین اور اس کے لانے والے کے ساتھ اُن کی محبت اور وابستگی میں انہوں نے کسی قسم کی کمزوری نہ دکھائی۔ بلکہ اغیار کی طرف سے جتنا جبر و تشدد بڑھتا چلا گیا اُتنا ہی اُن کا ایمان مضبوط ہوتا گیا۔

محبت کی زنجیر کو تلوار کا وار کاٹنے میں ہمیشہ ناکام رہا ہے اور یہ وہ نشہ ہے جسے کوئی تعزیر اور خوف اتار نہیں سکتا۔ جب ایک انسان اس "مقدس جرم" میں گرفتار ہو جاتا ہے تو پھر وہ اس سے رہائی پانے کی تمنا نہیں کرتا بلکہ اسے وہ اپنی زندگی کا اصل سرمایہ سمجھتا ہے اور اس جرم

کی پاداش میں اُسے جو مصیبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں وہ اُس کے عشق کو بڑھانے اور ترقی دینے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ تاریخِ اسلامی اس "ذوقِ جرم" کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ کس مسلمان کی نگاہ سے نہیں گزرا۔ انہیں جب کفارِ مکہ نے شہید کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے کہا تم مجھے اتنی مہلت دے دو کہ میں دو رکعت نماز ادا کر لوں۔ کفار نے اُن کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس کی اجازت دے دی۔ آپ نے اس مقدس فرض کو ذرا عجلت سے انجام دیا اور کفار کو مخاطب ہو کر فرمانے لگے: قسم ہے خالقِ کائنات کی کہ اگر مجھے اس بات کا خدشہ نہ ہوتا کہ تم میری نماز کی طوالت کو میری بزدلی پر محمول کرو گے تو میں اپنے مالک کے ساتھ کچھ دیر تک مزید سرگوشیاں کرتا لیکن میں نے اسے اس لیے جلدی ختم کیا ہے کہ تمہارے دلوں میں کہیں یہ احساس نہ پیدا ہو جاتے کہ میں موت کو اپنے سامنے پا کر گھبرا گیا ہوں۔ پھر آپ نے وہ مشہور اشعار پڑھے جن کے ابتدائی حصے میں کفار کے ہجوم کا ذکر ہے، درمیانی حصے میں اپنے خدا کے سامنے عجز و نیاز کا اظہار ہے اور آخر میں عزم و ہمت اور شہادت کے شوق کا تذکرہ ہے۔ ہم یہاں ان اشعار کے صرف آخری حصے کو نقل کرتے ہیں۔ جن سے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی دلی کیفیات کا اندازہ ہو سکتا ہے:۔

وَقَدْ خَیَّرُوْنِی الْکُفْرَ وَالْمَوْتَ دُوْنَہ

فقد ذرفت عَیْنَایَ من غیرِ مجزعٖ[1]

(انہوں نے مجھے کفر اور موت میں سے ایک چیز کا اختیار دیا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں لیکن یہ جزع فزع نہیں (خشیتِ الٰہی کے آنسو ہیں)

وَمَا بِیْ حِذَارُ الموتِ، انّی لمیّتٌ

ولکن حذاری جحمِ نارِ ملفع

---

[1] اس لفظ میں اختلاف ہے۔ سیرت ابن ہشام میں یہ لفظ مُجْزَعٖ ہے۔ لیکن زاد المعاد میں یہ لفظ مُدْمِعٖ ہے۔

"مجھے موت کا کوئی خوف نہیں (دیر یا سویر) مجھے بہرحال مرنا ہے۔ لیکن میں جہنم کے اُن شعلوں سے خوفزدہ ہوں جو دُور دُور تک لپیٹ میں لینے والے ہیں۔"

فواللّٰہِ ما ارجو اذا ما مت مسلمًا

علیٰ ایّ جنبٍ کان فی اللّٰہ مَصرَعی[۱]

خدا کی قسم میری دلی آرزو اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مَیں مسلمان (کی حالت میں) مروں اور میں (قتل ہو کر) جس پہلو بھی گروں، میرا گرنا اللہ ہی کے لیے ہو۔"

فلستُ بِمُبدٍ للعدوِّ تخشّعًا

ولا جزعًا، انّی الی اللّٰہ مرجعی

"پس میں، دشمن کے سامنے کسی قسم کی ذلت اور گھبراہٹ ظاہر کرنے والا نہیں۔ کیونکہ مَیں تو اپنے مالکِ حقیقی کی طرف لوٹ کر جا رہا ہوں۔"

یہ اشعار بھی حضرت خبیبؓ کے عزم و استقلال کی پوری پوری شہادت دیتے ہیں لیکن ان اشعار کے اختتام پر جب ابوسفیان نے حضورِ سرورِ دو عالمؐ کے بارے میں اُن سے ایک سوال کیا تو حضرت خبیبؓ نے اُس کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ انسانی تاریخ میں ہمیشہ ایک مقدس یادگار کے طور پر قائم رہے گا اور لوگ اسے سُن کر یا اسے پڑھ کر اپنے ایمان کا فیصلہ کیا کریں گے۔ راہِ حق کے اس شہید کے ان تاریخی الفاظ میں ایک مسلمان اپنے اخلاص، تعلق باللہ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کا صحیح طور پر اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ الفاظ دراصل ایمان کی کسوٹی اور دین سے وابستگی کا ایک بالکل صحیح پیمانہ ہیں۔

ابوسفیان اور حضرت خبیبؓ کے درمیان اس موقع پر جو گفتگو ہوئی اسے ان کے الفاظ ہی میں سُنیے۔ حضرت خبیبؓ نے اپنے دلی جذبات کا جس انداز سے اظہار کیا ہے الفاظ کا کوئی

[۱] بعض نسخوں میں مضجعی ہے اور یہ شعر یوں نقل کیا گیا ہے:

ولستُ ابالی حین اُقتلُ مسلمًا — علیٰ ایّ شقٍّ کان فی اللّٰہ مضجعی

ڈھانچہ اُن کی ترجمانی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہم اُن کے اصل الفاظ بھی نقل کرتے ہیں:

ابوسفیان نے کہا:

ایسرك ان محمدًا عندنا نضرب عنقه وانك فی اهلك۔	کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ اس وقت تم اپنے اہل و عیال میں زندہ ہوتے اور محمدؐ ہمارے پاس ہوتے اور ہم ان کی گردن مارتے (نعوذ باللہ)

اس سوال کے جواب میں اُس عاشقِ صادقؓ نے یہ فرمایا:

لا واللہ، ما یسرنی انی فی اهلی وان محمدًا فی مکانه الذی هو فیه تصیبه شوکة تؤذیه۔	(اے ابوسفیان! تم تو حضورؐ کی گردن مارنے کا ذکر کرتے ہو (یہ تو بڑی بات ہے) قسم ہے خدائے برتر کی، مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں اپنے اہل و عیال میں (آرام سے) رہوں اور اُدھر حضورؐ کے مقدس پاؤں میں ایک کانٹا بھی چُبھ جائے جو ان کے لیے اذیت کا باعث بنے۔

کونسا ایسا مسلمان ہے جس نے کفارِ مکہ کے لرزہ خیز مظالم کے تذکرے نہ پڑھے ہوں۔ اُن مظالم کا نقشہ جب آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ حقیقت بھی لوگوں کی نظروں سے کسی طرح اوجھل نہیں کہ ان مظالم کا تختۂ مشق بننے والے زیادہ تر وہ بے بس اور کمزور لوگ تھے جنہیں کسی طاقتور قبیلے کی تائید اور حمایت حاصل نہ تھی۔ وہ حضرات جن کا تعلق کسی مضبوط قبیلے سے تھا اُن پر ستم ڈھائے تو جاتے لیکن اُن کے معاملے میں کفار اتنے جری اور بیباک نہ ہوتے جتنے کہ ان بے سہارا لوگوں کے معاملے میں تھے۔ چنانچہ ان مظلوموں کی بے کسی کو دیکھ کر حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حبشہ میں ہجرت کرنے کی اجازت دی۔ لیکن تاریخ کے بہت سے

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

له زاد المعاد جلد دوم صفحہ ۲۷۹

تفہیم القرآن

فاطر

(۲)

لوگو، تم ہی اللہ کے محتاج ہو[۳۶] اور اللہ تو غنی و حمید ہے[۳۷]۔ وہ چاہے تو تمہیں ہٹا کر کوئی

[۳۶] یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ خدا تمہارا محتاج ہے، تم اسے خدا نہ مانو گے تو اس کی خدائی نہ چلے گی اور تم اس کی بندگی و عبادت نہ کرو گے تو اس کا کوئی نقصان ہو جائے گا۔ نہیں، اصل حقیقت یہ ہے کہ تم اس کے محتاج ہو۔ تمہاری زندگی ایک لمحہ کے لیے بھی قائم نہیں رہ سکتی اگر وہ تمہیں زندہ نہ رکھے اور وہ اسباب تمہارے لیے فراہم نہ کرے جن کی بدولت تم دنیا میں زندہ رہتے اور کام کر سکتے ہو۔ لہٰذا تمہیں اس کی طاعت و عبادت اختیار کرنے کی جو تاکید کی جاتی ہے وہ اس لیے نہیں ہے کہ خدا کو اس کی احتیاج ہے بلکہ اس لیے ہے کہ اسی پر تمہاری اپنی دنیا اور آخرت کی فلاح کا انحصار ہے۔ ایسا نہ کرو گے تو اپنا ہی سب کچھ بگاڑ لو گے، خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔

[۳۷] "غنی" سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے، ہر ایک سے مستغنی اور بے نیاز ہے، کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ اور "حمید" سے مراد یہ ہے کہ وہ آپ سے آپ محمود ہے، کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے مگر حمد (شکر اور تعریف) کا استحقاق اسی کو پہنچتا ہے۔ ان دونوں صفات کو ایک ساتھ اس لیے لایا گیا ہے کہ محض غنی تو وہ بھی ہو سکتا ہے جو اپنی دولت مندی سے کسی کو نفع نہ پہنچائے۔ اس صورت میں وہ غنی تو ہو گا مگر حمید نہ ہو گا۔ حمید وہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ وہ کسی سے خود تو کوئی فائدہ نہ اٹھائے مگر اپنی دولت کے خزانوں سے دوسروں کو ہر طرح کی نعمتیں عطا کرے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ ان دونوں صفات میں کامل ہے اس لیے فرمایا گیا کہ وہ محض غنی نہیں ہے بلکہ ایسا غنی ہے جسے ہر تعریف

نئی مخلوق تمہاری جگہ لے آئے، ایسا کرنا اللہ کے لیے کچھ بھی دشوار نہیں ہے۔[۳۸] کوئی بوجھ اٹھانے
والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔[۳۹] اور اگر کوئی لدا ہوا نفس اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے
پکارے گا تو اس کے بار کا ایک ادنیٰ حصہ بھی بٹانے کے لیے کوئی نہ آئے گا چاہے وہ
قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔[۴۰] (اے نبیؐ) تم تو صرف انہی لوگوں کو متنبہ کر سکتے ہو
جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔[۴۱] جو شخص بھی پاکیزگی اختیار

اور شکر کا استحقاق پہنچتا ہے کیونکہ وہ تمہاری اور تمام موجوداتِ عالم کی حاجتیں پوری کر رہا ہے۔

۳۸ یعنی تم کچھ اپنے بل بوتے پر اس کی زمین میں نہیں دندنا رہے ہو۔ اس کا ایک اشارہ اس بات کے لیے کافی ہے کہ تمہیں یہاں سے چلتا کرے اور کسی اور قوم کو تمہاری جگہ اٹھا کھڑا کرے۔ لہٰذا اپنی اوقات کو پہچانو اور وہ روش اختیار نہ کرو جس سے آخر کار قوموں کی شامت آیا کرتی ہے۔ خدا کی طرف سے جب کسی کی شامت آتی ہے تو ساری کائنات میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے اور اس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے روک سکے۔

۳۹ "بوجھ" سے مراد اعمال کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے، اور ہر ایک پر صرف اس کے اپنے ہی عمل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ایک شخص کی ذمہ داری کا بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی دوسرے پر ڈال دیا جائے۔ اور نہ یہی ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی ذمہ داری کا بار خود اپنے اوپر لے لے اور اسے بچانے کے لیے اپنے آپ کو اس کے جرم میں پکڑوا دے۔ یہ بات یہاں اس بنا پر فرمائی جا رہی ہے کہ مکہ معظمہ میں جو لوگ اسلام قبول کر رہے تھے ان سے ان کے مشرک رشتہ دار اور برادری کے لوگ کہتے تھے کہ تم ہمارے کہنے سے اس نئے دین کو چھوڑ دو اور دین آبائی پر قائم رہو، عذاب ثواب ہماری گردن پر۔

۴۰ اوپر کے فقرے میں اللہ کے قانونِ عدل کا بیان ہے کہ وہ ایک کے گناہ میں دوسرے کو نہ پکڑے گا، بلکہ ہر ایک کو اس کے اپنے ہی گناہ کا ذمہ دار ٹھہرائے گا۔ اور اس فقرے میں یہ بتایا گیا ہے

کرتا ہے اپنی ہی بھلائی کے لیے کرتا ہے۔ اور پلٹنا سب کو اللہ ہی کی طرف ہے۔ اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے۔ نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں۔ نہ ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی ہے۔ اور نہ زندے اور مُردے مساوی ہیں[۴۲]۔ اللہ جسے چاہتا ہے

کہ جو لوگ آج یہ بات کہہ رہے ہیں کہ تم ہماری ذمہ داری پر کفر و معصیت کا ارتکاب کرو، قیامت کے روز ہم تمہارا بارِ گناہ اپنے اوپر لے لیں گے، وہ دراصل محض ایک جھوٹا بھروسا دلا رہے ہیں۔ جب قیامت آئے گی اور لوگ دیکھ لیں گے کہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے وہ کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں تو ہر ایک کو اپنی پڑ جائے گی۔ بھائی بھائی سے اور باپ بیٹے سے منہ موڑ لیگا اور کوئی کسی کا ذرہ برابر بوجھ بھی اپنے اوپر لینے کے لیے تیار نہ ہوگا۔

۴۱ بالفاظِ دیگر ہٹ دھرم اور ہیکڑ لوگوں پر تمہاری تنبیہات کارگر نہیں ہو سکتیں۔ تمہارے سمجھانے سے تو وہی لوگ راہِ راست پر آسکتے ہیں جن کے دل میں خدا کا خوف ہے اور جو اپنے مالک حقیقی کے آگے جھکنے کے لیے تیار ہیں۔

۴۲ ان تمثیلات میں مومن اور کافر کے حال اور مستقبل کا فرق بتایا گیا ہے۔ ایک وہ شخص ہے جو حقائق سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہے اور کچھ نہیں دیکھتا کہ کائنات کا سارا نظام اور خود اس کا اپنا وجود کس صداقت کی طرف اشارے کر رہا ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کی آنکھیں کھلی ہیں اور وہ صاف دیکھ رہا ہے کہ اس کے باہر اور اندر کی ہر چیز خدا کی توحید اور اس کے حضور انسان کی جوابدہی پر گواہی دے رہی ہے۔ ایک وہ شخص ہے جو جاہلانہ اوہام اور مفروضات و قیاسات کی تاریکیوں میں بھٹک رہا ہے اور پیغمبر کی روشن کی ہوئی شمع کے قریب بھی پھٹکنے کے لیے تیار نہیں۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کی آنکھیں کھلی ہیں اور پیغمبر کی پھیلائی ہوئی روشنی سامنے آتے ہی اس پر یہ بات بالکل عیاں ہو گئی ہے کہ مشرکین اور کفار اور دہریے جن راہوں پر چل رہے ہیں وہ سب تباہی کی طرف جاتی ہیں اور فلاح کی راہ صرف وہ ہے جو خدا کے رسول نے دکھائی ہے۔ اب آخر یہ کیونکر ممکن ہے کہ دنیا میں ان دونوں کا رویہ یکساں ہو اور دونوں ایک ساتھ ایک ہی راہ پر چل سکیں؟ اور آخر یہ بھی کیسے ممکن ہے

سُنواتا ہے، مگر (اے نبیؐ) تم اُن لوگوں کو نہیں سُنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں۔[۴۳] تم تو بس
ایک خبردار کرنے والے ہو۔[۴۴] ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشارت دینے والا اور
ڈرانے والا بنا کر۔ اور کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبّہ کرنے والا نہ آیا ہو۔[۴۵]

کہ دونوں کا انجام یکساں ہو اور دونوں ہی مر کر فنا ہو جائیں، نہ ایک کو بدراہی کی سزا ملے، نہ دوسرا راست روی کا کوئی انعام پائے؟ "ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی نہیں ہے" کا اشارہ اسی انجام کی طرف ہے کہ ایک اللہ کے سایۂ رحمت میں جگہ پانے والا ہے اور دوسرا جہنم کی تپش میں جھُلسنے والا ہے۔ تم کس خیال خام میں مبتلا ہو کہ آخرکار دونوں ایک ہی انجام سے دوچار ہوں گے؟ آخر میں مومن کو زندہ سے اور ہٹ دھرم کافروں کو مُردہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی مومن وہ ہے جس کے اندر احساس و ادراک اور فہم و شعور موجود ہے اور اس کا ضمیر اُسے بھلے اور بُرے کی تمیز سے ہر وقت آگاہ کر رہا ہے۔ اور اس کے برعکس جو شخص کفر کے تعصب میں پوری طرح غرق ہو چکا ہے اس کا حال اُس اندھے سے بھی بدتر ہے جو تاریکی میں بھٹک رہا ہو، اس کی حالت تو اُس مُردے کی سی ہے جس میں کوئی حِس باقی نہ رہی ہو۔

۴۳ یعنی اللہ کی مشیت کی تو بات ہی دوسری ہے، وہ چاہے تو پتھروں کو سماعت بخش دے، لیکن رسول کے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ جن لوگوں کے سینے ضمیر کے مدفن بن چکے ہوں اُن کے دلوں میں اپنی بات اتار سکے اور جو بات سننا ہی نہ چاہتے ہوں اُن کے بہرے کانوں کو صدائے حق سُنا سکے۔ وہ تو انہی لوگوں کو سُنا سکتا ہے جو معقول بات پر کان دھرنے کے لیے تیار ہوں۔

۴۴ یعنی تمہارا کام لوگوں کو خبردار کر دینے سے زائد کچھ نہیں ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی ہوش میں نہیں آتا اور اپنی گمراہیوں ہی میں بھٹکتا رہتا ہے تو اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ اندھوں کو دکھانے اور بہروں کو سنانے کی خدمت تمہارے سپرد نہیں کی گئی ہے۔

۴۵ یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرمائی گئی ہے کہ دنیا میں کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے جس کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی مبعوث نہ فرمائے ہوں۔ سورۂ رعد میں فرمایا:

اب اگر یہ لوگ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلے دلائل[۴۶] اور صحیفے اور روشن ہدایات دینے والی کتاب[۴۷] لیکر آئے تھے۔ پھر جن لوگوں نے نہ مانا اُن کو میں نے پکڑ لیا اور دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی ع

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعہ سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں بھی سفید، سُرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں[۴۸]۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (آیت ۷)، سورۂ حجر میں فرمایا وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ (آیت ۱۰)، سورۂ نحل میں فرمایا وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (آیت ۳۶)۔ سورۂ شعراء میں فرمایا وَمَا اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ (آیت ۲۰۸)۔ مگر اس سلسلے میں دو باتیں سمجھ لینی چاہییں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ اوّل یہ کہ ایک نبی کی تبلیغ جہاں جہاں تک پہنچ سکتی ہو وہاں کے لیے وہی نبی کافی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ہر بستی اور ہر ہر قوم میں الگ الگ ہی انبیاء بھیجے جائیں۔ دوم یہ کہ ایک نبی کی دعوت و ہدایت کے آثار اور اس کی رہنمائی کے نقوشِ قدم جب تک محفوظ رہیں اُس وقت تک کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لازم نہیں کہ ہر نسل اور ہر پُشت کے لیے الگ نبی بھیجا جائے۔

[۴۶] یعنی ایسے دلائل جو اس بات کی صاف شہادت دیتے تھے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔

[۴۷] صحیفوں اور کتاب میں غالباً یہ فرق ہے کہ صحیفے زیادہ تر نصائح اور اخلاقی ہدایات پر مشتمل ہوتے تھے، اور کتاب ایک پوری شریعت لے کر آتی تھی۔

[۴۸] اس سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ خدا کی پیدا کردہ کائنات میں کہیں بھی یک رنگی و یکسانی نہیں ہے۔ ہر طرف تنوّع ہی تنوّع ہے۔ ایک ہی زمین اور ایک ہی پانی سے طرح طرح کے درخت نکل رہے ہیں اور ایک درخت کے دو پھل تک اپنے رنگ، جسامت اور مزے میں یکساں نہیں ہیں۔ ایک ہی پہاڑ کو دیکھو تو اس میں کئی کئی رنگ تمہیں نظر آئیں گے اور اس کے مختلف حصّوں کی مادّی ترکیب میں بڑا فرق پایا

صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اُس سے ڈرتے ہیں۔[۵۹] بے شک اللہ زبردست اور

جائے گا۔ انسانوں اور جانوروں میں ایک ماں باپ کے دو بچے تک یکساں نہ ملیں گے۔ اس کائنات میں اگر کوئی مزاجوں اور طبیعتوں اور ذہنیتوں کی یکسانی ڈھونڈے اور وہ اختلافات دیکھ کر گھبرا اُٹھے جن کی طرف اوپر (آیات نمبر ۱۹ تا ۲۸ میں) اشارہ کیا گیا ہے تو یہ اس کے اپنے فہم کی کوتاہی ہے۔ یہی تنوّع اور اختلاف تو پتہ دے رہا ہے کہ اس کائنات کو کسی زبردست حکیم نے بے شمار حکمتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کا بنانے والا کوئی بے نظیر خلاق اور بے مثل صناع ہے جو ہر چیز کا کوئی ایک ہی نمونہ لیے نہیں بیٹھ گیا ہے، بلکہ اس کے پاس ہر شے کے لیے نئے سے نئے ڈیزائن اور بے حد و حساب ڈیزائن ہیں۔ پھر خاص طور پر انسانی طبائع اور اذہان کے اختلاف پر کوئی شخص غور کرے تو اسے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ درحقیقت حکمتِ تخلیق کا شاہکار ہے۔ اگر تمام انسان پیدائشی طور پر اپنی افتادِ طبع اور اپنی خواہشات، جذبات، میلانات اور طرزِ فکر کے لحاظ سے یکساں بنا دیے جاتے اور کسی اختلاف کی کوئی گنجائش نہ رکھی جاتی تو دنیا میں انسان کی قسم کی ایک نئی مخلوق پیدا کرنا ہی سرے سے لاحاصل ہو جاتا۔ خالق نے جب اس زمین پر ایک ذمہ دار مخلوق اور اختیارات کی حامل مخلوق وجود میں لانے کا فیصلہ کیا تو اس فیصلے کی نوعیت کا لازمی تقاضا یہی تھا کہ اس کی ساخت میں ہر قسم کے اختلافات کی گنجائش رکھی جاتی۔ یہ چیز اس بات کی سب سے بڑی شہادت ہے کہ انسان کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک عظیم الشان حکیمانہ منصوبے کا نتیجہ ہے اور ظاہر ہے کہ حکیمانہ منصوبہ جہاں بھی پایا جائے گا وہاں لازماً اس کے پیچھے ایک حکیم ہستی کارفرما ہو گی۔ حکیم کے بغیر حکمت کا وجود صرف ایک احمق ہی فرض کر سکتا ہے۔

۵۹ یعنی جو شخص اللہ کی صفات سے جتنا زیادہ ناواقف ہو گا وہ اس سے اتنا ہی بے خوف ہو گا اور اس کے برعکس جس شخص کو اللہ کی قدرت، اس کے علم، اس کی حکمت، اس کی قہاری و جباری، اور اس کی دوسری صفات کی جتنی معرفت حاصل ہو گی اتنا ہی وہ اس کی نافرمانی سے خوف کھائے گا۔ پس درحقیقت اس آیت میں علم سے مراد فلسفہ و سائنس اور تاریخ و ریاضی وغیرہ درسی

درگزر فرمانے والا ہے۔ [۵۰]

جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں، یقیناً وہ ایک ایسی تجارت کے متوقع ہیں جس میں ہرگز خسارہ نہ ہوگا۔ (اس تجارت میں انہوں نے اپنا سب کچھ اس لیے کھپایا ہے) تاکہ اللہ ان کے اجر پورے کے پورے اُن کو دے اور مزید اپنے فضل سے ان کو عطا فرمائے۔ [۵۱]

علوم نہیں ہیں بلکہ صفاتِ الٰہی کا علم ہے قطع نظر اس سے کہ آدمی خواندہ ہو یا ناخواندہ۔ جو شخص خدا سے بے خوف ہے وہ علامۂ دہر بھی ہو تو اس علم کے لحاظ سے جاہلِ محض ہے۔ اور جو شخص خدا کی صفات کو جانتا ہے اور اس کی خشیّت اپنے دل میں رکھتا ہے وہ اَن پڑھ بھی ہو تو ذی علم ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ اس آیت میں لفظ "علماء" سے وہ اصطلاحی علماء بھی مراد نہیں ہیں جو قرآن و حدیث اور فقہ و کلام کا علم رکھنے کی بنا پر علمائے دین کہے جاتے ہیں۔ وہ اس آیت کے مصداق صرف اسی صورت میں ہوں گے جبکہ ان کے اندر خدا ترسی موجود ہو۔ یہی بات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمائی ہے کہ لیس العلم عن کثرۃ الحدیث ولکن العلم عن کثرۃ الخشیۃ "علم کثرتِ حدیث کی بنا پر نہیں ہے بلکہ خوفِ خدا کی کثرت کے لحاظ سے ہے۔" اور یہی بات حضرت حسن بصریؒ نے فرمائی ہے کہ العالم من خشی الرحمٰن بالغیب ورغب فیما رغب اللہ فیہ وزھد فیما سخط اللہ فیہ "عالم وہ ہے جو اللہ سے بے دیکھے ڈرے، جو کچھ اللہ کو پسند ہے اس کی طرف وہ راغب ہو، اور جس چیز سے اللہ ناراض ہے اس سے وہ کوئی دلچسپی نہ رکھے۔"

۵۰؎ یعنی وہ زبردست تو ایسا ہے کہ نافرمانوں کو جب چاہے پکڑ لے، کسی میں یارا نہیں کہ اس کی پکڑ سے بچ نکلے، مگر یہ اس کی شانِ عفو و درگزر ہے جس کی بنا پر ظالموں کو مہلت ملے جا رہی ہے۔

۵۱؎ اہلِ ایمان کے اس عمل کو تجارت سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ آدمی تجارت میں اپنا سرمایہ اور محنت و قابلیت اس امید پر صرف کرتا ہے کہ نہ صرف اصل واپس ملیگا، اور نہ صرف وقت اور محنت کی اجرت ملے گی، بلکہ کچھ مزید منافعہ بھی حاصل ہوگا۔ اسی طرح ایک مومن بھی خدا کی فرمانبرداری

بے شک اللہ بخشنے والا اور قدر دان ہے۔[۵۱] (اے نبی) جو کتاب ہم نے تمہاری طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجی ہے وہی حق ہے، تصدیق کرتی ہوئی آئی ہے اُن کتابوں کی جو اس سے پہلے آئی تھیں۔[۵۲] بے شک اللہ باخبر ہے اور ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے۔[۵۳] پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنا دیا اُن لوگوں کو جنہیں ہم نے (اس وراثت کے لیے) اپنے بندوں میں سے چُن لیا۔[۵۴]

میں، اس کی بندگی و عبادت میں، اور اس کے دین کی خاطر جدوجہد میں اپنا مال، اپنے اوقات، اپنی محنتیں اور قابلیتیں اس امید پر کھپا دیتا ہے کہ نہ صرف ان سب کا پورا پورا اجر ملے گا بلکہ اللہ اپنے فضل سے مزید بہت کچھ عنایت فرمائے گا۔ مگر دونوں تجارتوں میں فرق اور بہت بڑا فرق اس بنا پر ہے کہ دنیوی تجارت میں محض نفع ہی کی امید نہیں ہوتی، گھاٹے اور دیوالے تک کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے جو تجارت ایک مخلص بندہ اپنے خدا کے ساتھ کرتا ہے اُس میں کسی خسارے کا اندیشہ نہیں۔

۵۱؎ یعنی مخلص اہلِ ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اُس تنگ دل آقا کا سا نہیں ہے جو بات بات پر گرفت کرتا ہو اور ایک ذرا سی خطا پر اپنے ملازم کی ساری خدمتوں اور وفاداریوں پر پانی پھیر دیتا ہو۔ وہ فیاض اور کریم آقا ہے۔ جو بندہ اس کا وفادار رہا اس کی خطاؤں پر چشم پوشی سے کام لیتا ہے اور جو کچھ بھی خدمت اس سے بن آئی ہو اس کی قدر فرماتا ہے۔

۵۲؎ مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی نرالی بات نہیں پیش کر رہی ہے جو پچھلے انبیاءؑ کی لائی ہوئی تعلیمات کے خلاف ہو، بلکہ اسی ازلی و ابدی حق کو پیش کر رہی ہے جو ہمیشہ سے تمام انبیاءؑ پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔

۵۳؎ اللہ کی اِن صفات کو یہاں بیان کرنے کا مقصود اِس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ بندوں کے لیے خیر کس چیز میں ہے، اور ان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کیا اصول موزوں ہیں، اور کون سے ضابطے ٹھیک ٹھیک اُن کی مصلحت کے مطابق ہیں، اِن امور کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا، کیونکہ بندوں کی فطرت اور اُس کے تقاضوں سے وہی باخبر ہے، اور ان کے حقیقی مصالح پر وہی نگاہ رکھتا ہے۔ بندے خود اپنے آپ کو اتنا نہیں جانتے جتنا ان کا خالق اُن کو جانتا ہے۔ اس لیے حق وہی ہے اور وہی ہو سکتا ہے

اب کوئی تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے، اور کوئی بیچ کی راس ہے، اور کوئی اللہ کے اذن سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے، یہی بہت بڑا فضل ہے۔ ۵۶ ہمیشگی

جو اس نے وحی کے ذریعہ سے بتا دیا ہے۔

۵۵ مراد ہیں مسلمان جو پوری نوعِ انسانی میں سے چھانٹ کر نکالے گئے ہیں تاکہ وہ کتاب اللہ کے وارث ہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اُسے لیکر اٹھیں۔ اگرچہ کتاب پیش تو کی گئی ہے سارے انسانوں کے سامنے۔ مگر جنہوں نے آگے بڑھ کر اُسے قبول کر لیا وہی اس شرف کے لیے منتخب کر لیے گئے کہ قرآن جیسی کتابِ عظیم کے وارث اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے رسولِ عظیم کی تعلیم و ہدایت کے امین بنیں۔

۵۶ یعنی یہ مسلمان سب کے سب ایک ہی طرح کے نہیں ہیں، بلکہ یہ تین طبقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں:

(۱) اپنے نفس پر ظلم کرنے والے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کو سچے دل سے اللہ کی کتاب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمانداری کے ساتھ اللہ کا رسول تو مانتے ہیں، مگر عملاً کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی پیروی کا حق ادا نہیں کرتے۔ مومن ہیں مگر گناہ گار ہیں۔ مجرم ہیں مگر باغی نہیں ہیں ضعیف الایمان ہیں مگر منافق اور دل و دماغ سے کافر نہیں ہیں۔ اسی لیے ان کو ظالم لنفسہ ہونے کے باوجود وارثینِ کتاب میں داخل اور خدا کے چُنے ہوئے بندوں میں شامل کیا گیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ باغیوں اور منافقوں اور قلب و ذہن کے کافروں پر ان اوصاف کا اطلاق نہیں ہو سکتا تینوں درجات میں سے اس درجہ کے اہلِ ایمان کا ذکر سب سے پہلے اس لیے کیا گیا ہے کہ تعداد کے لحاظ سے امت میں کثرت انہی کی ہے۔

(۲) بیچ کی راس۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس وراثت کا حق کم و بیش ادا تو کرتے ہیں مگر پوری طرح نہیں کرتے۔ فرماں بردار بھی ہیں اور خطاکار بھی۔ اپنے نفس کو بالکل بے لگام تو انہوں نے نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اسے خدا کا مطیع بنانے کی اپنی حد تک کوشش کرتے ہیں، لیکن کبھی یہ اس کی باگیں ڈھیلی بھی چھوڑ دیتے ہیں اور گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اِن کی زندگی اچھے اور بُرے، دونوں طرح کے اعمال کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ یہ تعداد میں پہلے گروہ سے کم اور تیسرے گروہ سے زیادہ ہیں اس لیے ان کو دوسرے نمبر پر رکھا گیا ہے۔

کے قیام کی جنتیں ہیں جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے[۵۵]۔ وہاں انہیں سونے کے کنگنوں

(۳) نیکیوں میں سبقت کرنے والے۔ یہ وارثینِ کتاب میں صفِ اول کے لوگ ہیں یہی در اصل اس وراثت کا حق ادا کرنے والے ہیں۔ یہ اتباعِ کتاب و سنت میں بھی پیش پیش ہیں، خدا کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے میں بھی پیش پیش، دینِ حق کی خاطر قربانیاں کرنے میں بھی پیش پیش، اور بھلائی کے ہر کام میں پیش پیش۔ یہ دانستہ معصیت کرنے والے نہیں ہیں، اور نادانستہ کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس پر متنبہ ہوتے ہی ان کی پیشانیاں شرم سے عرق آلود ہو جاتی ہیں۔ ان کی تعداد امت میں پہلے دونوں گروہوں سے کم ہے اس لیے ان کا آخر میں ذکر کیا گیا ہے اگرچہ وراثت کا حق ادا کرنے کے معاملہ میں ان کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔

"یہی بہت بڑا فضل ہے"۔ اس فقرے کا تعلق اگر قریب ترین فقرے سے مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نیکیوں میں سبقت کرنا ہی بڑا فضل ہے اور جو لوگ ایسے ہیں وہ امتِ مسلمہ میں سب سے افضل ہیں۔ اور اس فقرے کا تعلق پہلے فقرے سے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ کتاب اللہ کا وارث ہونا اور اس وراثت کے لیے چن لیا جانا بڑا فضل ہے، اور خدا کے تمام بندوں میں وہ بندے سب سے افضل ہیں جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر اس انتخاب میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

[۵۵] مفسرین میں سے ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ اس فقرے کا تعلق قریب ترین دونوں فقروں سے ہے، یعنی نیکیوں پر سبقت کرنے والے ہی بڑی فضیلت رکھتے ہیں اور وہی ان جنتوں میں داخل ہوں گے۔ رہے پہلے دو گروہ، تو ان کے بارے میں سکوت اختیار فرمایا گیا ہے تاکہ وہ اپنے انجام کے معاملہ میں فکر مند ہوں اور اپنی موجودہ حالت سے نکل کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ اس رائے کو علامہ زمخشری نے بڑے زور کے ساتھ بیان کیا ہے اور امام رازی نے اس کی تائید کی ہے۔

لیکن مفسرین کی اکثریت یہ کہتی ہے کہ اس کا تعلق اوپر کی پوری عبارت سے ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ امت کے یہ تینوں گروہ بالآخر جنت میں داخل ہوں گے، خواہ محاسبہ کے بغیر یا

محاسبہ کے بعد، خواہ ہر مواخذہ سے محفوظ رہ کر یا کوئی سزا پانے کے بعد۔ اسی تفسیر کی تائید قرآن کا سیاق و سباق کرتا ہے، کیونکہ آگے چل کر وارثین کتاب کے بالمقابل دوسرے گروہ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ "اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے لیے جہنم کی آگ ہے" اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے اس کتاب کو مان لیا ہے ان کے لیے جنت ہے اور جنہوں نے اس پر ایمان لانے سے انکار کیا ہے اُن کے لیے جہنم۔

پھر اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث کرتی ہے جسے حضرت ابو الدرداؓ نے روایت کیا ہے اور امام احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم، طبرانی، بیہقی اور بعض دوسرے محدثین نے اسے نقل کیا ہے۔ اس میں حضورؐ فرماتے ہیں:

فاما الذین سبقوا فاولٓئک الذین یدخلون الجنۃ بغیر حساب، واما الذین اقتصدوا فاولٓئک الذین یحاسبون حسابا یسیرا، واما الذین ظلموا انفسہم فاولٓئک یحبسون طول المحشر ثم ھم الذین تتلقاھم اللہ برحمتہ فھم الذین یقولون الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن۔	جو لوگ نیکیوں میں سبقت لے گئے ہیں وہ جنت میں کسی حساب کے بغیر داخل ہوں گے۔ اور جو بیچ کی راس رہے ہیں ان سے محاسبہ ہوگا مگر ہلکا محاسبہ۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے تو وہ محشر کے پورے طویل عرصہ میں روک رکھے جائیں گے پھر انہی کو اللہ اپنی رحمت میں لے لیگا اور یہی لوگ ہیں جو کہیں گے کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم سے غم دُور کر دیا۔

اس حدیث میں حضورؐ نے اس آیت کی پُوری تفسیر خود بیان فرما دی ہے اور اہل ایمان کے تینوں طبقوں کا انجام الگ الگ بتا دیا ہے۔ بیچ کی راس والوں سے "ہلکا محاسبہ" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کفار کو تو ان کے کفر کے علاوہ اُن کے ہر ہر جُرم کی جُداگانہ سزا بھی دی جائے گی، مگر اس کے برعکس اہلِ ایمان میں جو لوگ اچھے اور بُرے دونوں طرح کے اعمال لیکر پہنچیں گے اُن کی نیکیوں اور ان کے گناہوں کا مجموعی محاسبہ ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ ہر نیکی کی الگ جزا اور ہر قصور کی الگ سزا دی جائے۔ اور یہ جو فرمایا کہ اہلِ ایمان میں سے جن لوگوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہوگا وہ محشر کے پُورے عرصے میں روک رکھے جائیں گے،

اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا، وہاں ان کا لباس ریشم ہوگا، اور وہ کہیں گے کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم سے غم دُور کر دیا۵۸ یقیناً ہمارا رب معاف کرنے والا اور قدر فرمانے والا ہے۵۹ جس نے ہمیں اپنے فضل سے ابدی قیام کی جگہ ٹھیرا دیا۶۰ اب یہاں نہ ہمیں کوئی مشقت پیش آتی ہے اور نہ تکان لاحق ہوتی ہے۶۱

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہنم میں نہیں ڈالے جائیں گے بلکہ ان کو "تا برخاست عدالت" کی سزا دی جائے گی، یعنی روزِ حشر کی پوری طویل مدت (جو نہ معلوم کتنی صدیوں کے برابر طویل ہوگی) اُن پر اپنی ساری سختیوں کے ساتھ گزر جائے گی، یہاں تک کہ آخر کار اللہ ان پر رحم فرمائے گا اور خاتمۂ عدالت کے وقت حکم دے گا کہ اچھا، انہیں بھی جنت میں داخل کر دو۔

اسی مضمون کے متعدد اقوال محدثین نے بہت سے صحابہ، مثلاً حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عائشہ، حضرت ابو سعید خُدری اور حضرت براء ابن عازب سے نقل کیے ہیں، اور ظاہر ہے کہ صحابہ ایسے معاملات میں کوئی بات اُس وقت تک نہیں کہہ سکتے تھے جب تک انہوں نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو نہ سنا ہو۔

۵۸ ہر قسم کا غم۔ دنیا میں جن فکروں اور پریشانیوں میں ہم مبتلا تھے اُن سے بھی نجات ملی، عُقبیٰ میں اپنے انجام کی جو فکر لاحق تھی وہ بھی ختم ہوئی، اور اب آگے چین ہی چین ہے، کسی رنج والم کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہا۔

۵۹ یعنی ہمارے قصور اس نے معاف فرما دیئے اور عمل کی جو تھوڑی سی پُونجی ہم لائے تھے اس کی ایسی قدر فرمائی کہ اپنی جنت اس کے بدلے ہمیں عطا فرما دی۔

۶۰ یعنی دنیا ہماری سفرِ حیات کی ایک منزل تھی جس سے ہم گزر آئے ہیں، اور میدانِ حشر بھی اس سفر کا ایک مرحلہ تھا جس سے ہم گذر لیے ہیں، اب ہم اُس جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں سے نکل کر پھر کہیں جانا نہیں ہے۔

۶۱ بالفاظِ دیگر ہماری تمام محنتوں اور تکلیفوں کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب یہاں ہمیں کوئی ایسا کام

اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے[۶۲] ان کے لیے جہنم کی آگ ہے۔ نہ اُن کا قصہ پاک کر دیا جائے گا کہ مر جائیں اور نہ اُن کے لیے جہنم کے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی۔ اِس طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ہر اُس شخص کو جو کفر کرنے والا ہو۔ وہ وہاں چیخ چیخ کر کہیں گے کہ "اے ہمارے رب، ہمیں یہاں سے نکال لے، اب ہم نیک عمل کریں گے اُن اعمال سے مختلف جو پہلے کرتے رہے تھے۔" (انہیں جواب دیا جائے گا) "کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا؟[۶۳] اور تمہارے پاس متنبہ کرنے والا بھی آ چکا تھا۔ اب مزا چکھو۔ ظالموں کا یہاں کوئی مددگار نہیں ہے۔" ع ۴ ع

بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ چیز سے واقف ہے، وہ تو سینوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے[۶۴]۔ اب

نہیں کرنا پڑتا جس کے انجام دینے میں ہم کو مشقت پیش آتی ہو اور جس سے فارغ ہو کر ہم تھک جاتے ہوں۔

[۶۲] یعنی اُس کتاب کو ماننے سے انکار کر دیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی ہے۔

[۶۳] اس سے مراد ہر وہ عمر ہے جس میں آدمی اس قابل ہو سکتا ہو کہ اگر وہ نیک و بد اور حق و باطل میں امتیاز کرنا چاہے تو کر سکے اور گمراہی چھوڑ کر ہدایت کی طرف رجوع کرنا چاہے تو کر سکے۔ اس عمر کو پہنچنے سے پہلے اگر کوئی شخص مر چکا ہو تو اس آیت کی رُو سے اُس پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔ البتہ جو اس عمر کو پہنچ چکا ہو وہ اپنے عمل کے لیے لازماً جواب دہ قرار پائے گا، اور پھر اس عمر کے شروع ہو جانے کے بعد جتنی مدت بھی وہ زندہ رہے اور سنبھل کر راہِ راست پر آنے کے لیے جتنے مواقع بھی اسے ملتے چلے جائیں اتنی ہی اس کی ذمہ داری شدید تر ہوتی چلی جائے گی، یہاں تک کہ جو شخص بڑھاپے کو پہنچ کر بھی سیدھا نہ ہو اس کے لیے کسی عذر کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ یہی بات ہے جو ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت سہلؓ بن سعد ساعدی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمائی ہے کہ جو شخص کم عمر پائے اس کے لیے تو عذر کا موقع ہے، مگر ۶۰ سال اور اس سے اوپر عمر پانے والے

جو کوئی کفر کرتا ہے اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے[۶۵]، اور کافروں کو اُن کا کفر اس کے سوا کوئی ترقی نہیں دیتا کہ ان کے رب کا غضب اُن پر زیادہ سے زیادہ بھڑکتا چلا جاتا ہے۔ کافروں کے لیے خسارے میں اضافے کے سوا کوئی ترقی نہیں۔

(اے نبی) ان سے کہو "کبھی تم نے دیکھا بھی ہے اپنے اُن شریکوں کو[۶۶] جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہو؟ مجھے بتاؤ، انہوں نے زمین میں کیا پیدا کیا ہے؟ یا آسمانوں میں ان کی کیا شرکت ہے؟" (اگر یہ نہیں بتا سکتے تو ان سے پوچھو) کیا ہم نے انہیں کوئی تحریر لکھ کر دی ہے جس کی بنا پر یہ (اپنے اس شرک کے لیے) کوئی صاف سند رکھتے ہوں[۶۷]؟ نہیں، بلکہ یہ ظالم ایک

کے لیے کوئی عذر نہیں ہے (بخاری، احمد، نسائی، ابن جریر اور ابن ابی حاتم وغیرہ)۔

۶۴۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اس نے پچھلی نسلوں اور قوموں کے گزر جانے کے بعد اب تم کو اُن کی جگہ اپنی زمین میں بسایا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اس نے تمہیں زمین میں تصرف کے جو اختیارات دیئے ہیں وہ اس حیثیت سے نہیں ہیں کہ تم ان چیزوں کے مالک ہو، بلکہ اس حیثیت سے ہیں کہ تم اصل مالک کے خلیفہ ہو۔

۶۵۔ اگر پہلے فقرے کا یہ مطلب لیا جائے کہ تم کو پچھلی قوموں کا جانشین بنایا ہے تو اس فقرے کے معنی یہ ہوں گے کہ جس نے گزشتہ قوموں کے انجام سے کوئی سبق نہ لیا اور وہی کفر کا رویہ اختیار کیا جس کی بدولت وہ قومیں تباہ ہو چکی ہیں وہ اپنی اس حماقت کا نتیجہ بد دیکھ کر رہے گا۔ اور اگر اُس فقرے کا مطلب یہ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنے خلیفہ کی حیثیت سے زمین میں اختیارات عطا کیے ہیں تو اس فقرے کے معنی یہ ہوں گے کہ جو اپنی حیثیتِ خلافت کو بھول کر خود مختار بن بیٹھا یا جس نے اصل مالک کو چھوڑ کر کسی اور کی بندگی اختیار کر لی وہ اپنی اس باغیانہ روش کا بُرا انجام دیکھ لے گا۔

۶۶۔ "اپنے شریک" کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا گیا ہے کہ درحقیقت وہ خدا کے شریک تو ہیں نہیں، مشرکین نے ان کو اپنے طور پر اُس کا شریک بنا رکھا ہے۔

دوسرے کو محض فریب کے جھانسے دیئے جا رہے ہیں۔[۶۸] حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے، اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا انہیں تھامنے والا نہیں ہے۔[۶۹] بے شک اللہ بڑا حلیم اور درگزر فرمانے والا ہے۔[۷۰]

---

۶۷ یعنی کیا ہمارا لکھا ہوا کوئی پروانہ ان کے پاس ایسا ہے جس میں ہم نے یہ تحریر کیا ہو کہ فلاں فلاں اشخاص کو ہم نے بیماروں کو تندرست کرنے، یا بے روزگاروں کو روزگار دلوانے، یا حاجتمندوں کی حاجتیں پوری کرنے کے اختیارات دیئے ہیں، یا فلاں فلاں ہستیوں کو ہم نے اپنی زمین کے فلاں حصوں کا مختار کار بنا دیا ہے اور ان علاقوں کے لوگوں کی قسمتیں بنانا اور بگاڑنا اب ان کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا ہمارے بندوں کو اب انہی سے دعائیں مانگنی چاہییں اور انہی کے حضور نذریں اور نیازیں چڑھانی چاہییں اور جو نعمتیں بھی ملیں ان پر انہی "چھوٹے خداؤں" کا شکر بجا لانا چاہیے۔ ایسی کوئی سند اگر تمہارے پاس ہے تو لاؤ اسے پیش کرو۔ اور اگر نہیں ہے تو خود ہی سوچو کہ یہ مشرکانہ عقائد اور اعمال آخر تم نے کس بنیاد پر ایجاد کر لیے ہیں۔ تم سے پوچھا جاتا ہے کہ زمین اور آسمان میں کہیں تمہارے ان بناوٹی معبودوں کے شریکِ خدا ہونے کی کوئی علامت پائی جاتی ہے؟ تم اس کے جواب میں کسی علامت کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔ تم سے پوچھا جاتا ہے کہ خدا نے اپنی کسی کتاب میں یہ فرمایا ہے، یا تمہارے پاس یا ان بناوٹی معبودوں کے پاس خدا کا دیا ہوا کوئی پروانہ ایسا موجود ہے جو اس امر کی شہادت دیتا ہو کہ خدا نے خود انہیں وہ اختیارات عطا فرمائے ہیں جو تم ان کی طرف منسوب کر رہے ہو؟ تم وہ بھی پیش نہیں کر سکتے۔ اب آخر وہ چیز کیا ہے جس کی بنا پر تم اپنے یہ عقیدے بنائے بیٹھے ہو؟ کیا تم خدائی کے مالک ہو کہ خدا کے اختیارات جس جس کو چاہو بانٹ دو؟

۶۸ یعنی یہ پیشوا اور پیر، یہ پنڈت اور پروہت، یہ کاہن اور واعظ، یہ مجاور اور ان کے ایجنٹ محض اپنی دوکان چمکانے کے لیے عوام کو اُلّو بنا رہے ہیں اور طرح طرح کے قصے گھڑ گھڑ کر لوگوں کو یہ جھوٹے بھروسے دلا رہے ہیں کہ خدا کو چھوڑ کر فلاں فلاں ہستیوں کے دامن تھام لو گے تو دنیا میں تمہارے سارے کام بن جائیں گے اور آخرت میں تم چاہے کتنے ہی گناہ سمیٹ کر لے جاؤ، وہ اللہ سے تمہیں بخشوا لیں گے۔

۶۹ یعنی یہ اتھاہ کائنات اللہ تعالیٰ کے قائم رکھنے سے قائم ہے۔ کوئی فرشتہ یا جن یا نبی یا ولی

یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا ہوتا تو یہ دنیا کی ہر دوسری قوم سے بڑھ کر راست رَو ہوتے[61] مگر جب خبردار کرنے والا ان کے پاس آگیا تو اس کی آمد نے اِن کے اندر حق سے فرار کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔ یہ زمین میں اور زیادہ استکبار کرنے لگے اور بُری بُری چالیں چلنے لگے، حالانکہ بُری چالیں اپنے چلنے والوں ہی کو لے بیٹھتی ہیں۔ اب کیا یہ لوگ اِس کا انتظار کر رہے ہیں کہ پچھلی قوموں کے ساتھ اللہ کا جو طریقہ رہا ہے وہی اِن کے ساتھ بھی برتا جائے؟[62] یہی بات ہے تو تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقرر راستے سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے۔ کیا یہ لوگ زمین میں کبھی چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان سے بہت زیادہ طاقتور تھے؟ اللہ کو کوئی چیز عاجز کرنے والی نہیں ہے، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اگر کہیں وہ لوگوں کو اُن کے کیے کرتوتوں پر پکڑتا تو زمین پر کسی متنفس کو جیتا نہ چھوڑتا۔ مگر وہ انہیں ایک مقررہ وقت تک کے لیے مہلت دے رہا ہے۔ پھر جب ان کا وقت آن پورا ہو گا تو اللہ اپنے بندوں کو دیکھ لے گا۔ ع ۵

اس کو سنبھالے ہوئے نہیں ہے۔ کائنات کو سنبھالنا تو درکنار، یہ بے بس بندے تو اپنے وجود کو سنبھالنے پر بھی قادر نہیں۔ ہر ایک اپنی پیدائش اور اپنے بقاء کے لیے ہر آن اللہ جل شانہ کا محتاج ہے۔ ان میں سے کسی کے متعلق یہ سمجھنا کہ خدائی کی صفات اور اختیارات میں اس کا کوئی حصہ ہے خالص حماقت اور فریب خوردگی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

۶۰ہ یعنی یہ سراسر اللہ کا حلم اور اس کی چشم پوشی ہے کہ اتنی بڑی گستاخیاں اس کی جناب میں کی جا رہی ہیں اور پھر بھی وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کر رہا ہے۔

۶۱ہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب کے لوگ عموماً اور قریش کے لوگ خصوصاً یہود و نصاریٰ کی بگڑی ہوئی اخلاقی حالت کو دیکھ کر کہا کرتے تھے۔ اُن کے اس قول کا ذکر اس سے پہلے سورۂ انعام (آیات ۱۵۶-۱۵۷) میں بھی گزر چکا ہے اور آگے سورۂ صافات (۱۶۷ تا ۱۶۹) میں بھی آ رہا ہے۔

۶۲ہ یعنی اللہ کا یہ قانون اِن پر بھی جاری ہو جائے کہ جو قوم اپنے نبی کو جھٹلاتی ہے وہ تباہ کر کے رکھ دی جاتی ہے۔

سعودی عرب میں سوشل اصلاحات

—— اجتماعی تحفظ و کفالت کے تازہ ترین احکام ——

[ذیل میں ہم اُن شاہی فرامین کا خلاصہ نقل کر رہے ہیں جو سعود بن عبدالعزیز، فرمانروائے مملکت سعودیہ نے ماہ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ میں مختلف ایام میں صادر کیے ہیں۔ اور جن کو "فرامین عدلِ اجتماعی" کا نام دیا گیا ہے۔ ان فرامین کی رُو سے سرکاری ملازمین کی دولت کی تحقیق کی جائے گی اور ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ دولت کو ضبط کر لیا جائے گا۔ رشوت، سفارش اور محکمانہ اثر و رسوخ کے ناجائز استعمال کا انسداد کیا جائے گا اور ملک کے تمام حاجت مند افراد کو مستقل یا عارضی امداد کے ذریعہ سرکاری کفالت میں لیا جائے گا۔ اور عام معاشرتی تحفظات رُوبعمل لائے جائیں گے۔ اس غرض کے لیے ملکی بجٹ میں مطلوبہ رقم مخصوص کرنے کے علاوہ زکوٰۃ کے محاصل کو استعمال کیا جائے گا۔ سعودی عرب میں زکوٰۃ کے جمع و صرف کا انتظام خود حکومت کرتی ہے جس سے اُسے لاکھوں روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔ سالِ رواں کے بجٹ میں بمد زکوٰۃ حاصل ہونے والی آمدنی ۳۸ لاکھ ریال (ریال ایک پاکستانی روپے سے کچھ زائد ہوتا ہے) دکھائی گئی ہے۔ یہ رقم خطیر ہی ملک بھر کے حاجت مند افراد کی کفالت و امداد کے سلسلے میں کافی بوجھ ہلکا کر دے گی۔ مزید برآں حسبِ ضرورت ملکی خزانے سے بھی کسر پوری کی جائے گی۔ ان تحفظات و انتظامات کے ساتھ اگر حکومت سعودی عرب شرعی سزائیں نافذ کرتی ہے اور چوری کرنے والوں کے ہاتھ کاٹتی ہے تو وہ حق بجانب ہے۔ (خلیل حامدی)]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قانون تحقیق دولت ملازمین

بتوفیق خداوندی ہم سعود بن عبدالعزیز آل سعود سلطان مملکت عربیہ سعودیہ بعد آگاہی دفعہ ۱۹ برائے قانونِ کابینہ بمطابق فرمان شاہی نمبر ۳۸ محریہ ۲۲-۱۰-۷۷ھ - اور بروئے قرارداد کابینہ نمبر ۱۸۴ محریہ ۲۶-۲-۸۲ - اور بربنائے معروض وزیراعظم، فرمان ذیل صادر کرتے ہیں :

اولاً : اجتماعی مصالح کے پیشِ نظر، کابینہ کا فرض ہے کہ وہ تمام سرکاری ملازمین کا محاسبہ کرے اور جائزہ لے کہ اُن کے ذاتی سرمایہ، ان کی کم سن اور بالغ اولاد کے سرمایہ جن کی بظاہر کوئی آمدنی نہیں ہے، اور اُن کی بیویوں کے سرمایہ کے ذرائع کیا ہیں۔ اس امر کی تحقیقات کے لیے ایک سہ رکنی کمیٹی قائم کرے جس کا چیئرمین پبلک سنسر ڈیپارٹمنٹ کا افسر اعلیٰ ہو اور محکمہ شکایات عامہ کے دو مفتش اس کے رکن ہوں ۔ یہ کمیٹی اس امر کی مجاز ہو گی کہ وہ اپنی مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری ماہرِ حسابات و پڑتال (EXPRT IN AUDITONG ACCOUNTS) کی مدد حاصل کرے

ثانیاً : اگر کوئی ملازم اپنی ملکیت یا سرمائے یا مذکورۂ بالا افراد کی ملکیت یا سرمائے کا جائز ماخذ ثابت کرنے سے قاصر رہے — اور یہ صورت اس شبہ کو تقویت دینے کے لیے کافی ہے کہ یہ ملکیت یا سرمایہ رشوت یا تحائف وعطیات یا منصب کے ناجائز استعمال کے بل بوتے پر جمع کیا گیا ہے تو کابینہ پر لازم ہے کہ وہ مذکورہ کمیٹی کی سفارش کی بنا پر ایسے مشکوک اور مجہول الماخذ سرمائے کا نصف حصہ بحقِ سرکار ضبط کرے۔ اور اس ملازم کو سرکاری ملازمت سے برطرف کر دے۔

ثالثاً : یہ فرمان کسی فوجداری جرم پر اثر انداز نہیں ہو گا بشرطیکہ اس جرم کی شرائط پائی جاتی ہوں۔

رابعاً : ہمارے وزیراعظم اور ہمارے وزراء پر لازم ہے کہ ہر ایک اپنے اختیارات کے دائرے میں اس فرمان کو اس کی تاریخ اشاعت سے نافذ العمل کرے۔

مِن اَین لک ھذا! اجتماعی مصلحت کو بروئے کار لانے کے لیے ریاست پر یہ لازم ہے کہ وہ ملازمینِ حکومت کی دولت و ثروت پر کڑی نگرانی رکھے اور اگر وہ جائز ذرائع سے تجاوز کر رہے ہوں تو ان کی

سرکوبی کرے۔ شرعی طور پر کسب صرف وہ جائز ہے جو کسی حرام طریقے سے نہ ہو۔ چنانچہ خیانت، رشوت، غبن اور منصب کے ناجائز استعمال کے ذریعے سے کسب اسلام میں حرام ہے۔ شریعت نے جو حدود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز کر کے جو دولت حاصل ہوئی ہو اس کے بارے میں یہ سوال اٹھانے کا مسلمانوں کو حق پہنچتا ہے کہ مِنْ اَیْنَ لَکَ ھٰذَا؟ دیکھیے یہ کہاں سے ملا ہے؟ اس دولت کے بارے میں پہلے قانونی تحقیق کرنی چاہیے۔ پھر اگر ثابت ہو جائے کہ وہ جائز ذرائع سے حاصل نہیں ہوئی ہے تو اسے ضبط کرنے کا اسلامی حکومت کو پورا حق پہنچتا ہے۔ جلالۃ الملک کی حکومت کا یہ اقدام اسلام کے اسی تقاضے پر مبنی ہے۔

قانون انسداد رشوت ستانی

دفعہ اول: جو سرکاری ملازم اپنے کسی منصبی فرض کو ادا کرنے کے عوض اپنی ذات کے لیے یا کسی دوسرے کے نام سے کوئی عطیہ طلب کرتا ہے یا قبول کرتا ہے یا طے کرتا ہے اُسے رشوت خور سمجھا جائے گا اور ایک سال سے لے کر ۵ سال تک کی قید یا ۵ ہزار سے لے کر ایک لاکھ ریال جرمانہ کی سزا کا یا بیک وقت ان دونوں سزاؤں کا مستوجب ہوگا اور ملازم کا یہ دعویٰ جرم پر اثر انداز نہیں ہوگا کہ وہ رشوت کے عوض طے شدہ کام کو انجام دینے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا۔

دفعہ دوم: جو سرکاری ملازم اپنے کسی منصبی فرض سے دستبردار ہو جانے کے عوض اپنی ذات کے لیے یا کسی دوسرے کے لیے کوئی عطیہ طلب کرتا ہے یا قبول کرتا ہے یا طے کرتا ہے اُسے "رشوت خور" سمجھا جائے گا اور اُس سزا کا مستحق ہوگا جو دفعہ اول میں بیان کی گئی ہے۔

دفعہ سوم: جو ملازم اپنے منصبی فرائض میں خلل اندازی کے عوض یا خلل اندازی کے بعد بطور صلہ اپنی ذات کے لیے یا کسی دوسرے کے لیے عطیہ طلب کرے گا یا قبول کرے گا یا طے کرے گا وہ اُس سزا کا مستوجب ہوگا جو دفعہ اول میں مذکور ہے۔

دفعہ چہارم: جو ملازم کسی سفارش کے نتیجے میں کوئی کام کرتا ہے یا اپنے فرائض منصبی سے دستبردار ہو جاتا ہے وہ "رشوت خور" کے حکم میں داخل ہوگا وہ زیادہ سے زیادہ ایک سال قید بامشقت

یا زیادہ سے زیادہ دس ہزار ریال جرمانہ کی سزا یا بیک وقت دونوں سزاؤں کا مستوجب ہوگا۔

دفعہ پنجم: جو ملازم اپنے اثر و نفوذ کے ذریعہ، خواہ وہ حقیقی ہو یا فرضی، کسی با اختیار ادارہ سے کوئی کام یا آرڈر یا ریزولیشن یا لائسنس یا ٹھیکہ یا درآمدی پرمٹ یا ڈگری حاصل کرنے یا حاصل کرنے کی کوشش کے عوض اپنی ذات کے لیے یا کسی دوسرے فرد کے لیے کوئی عطیہ طلب کرتا ہے یا قبول کرتا ہے یا طے کرتا ہے وہ "رشوت خور" کے حکم میں داخل ہوگا اور اُسی سزا کا مستحق ہوگا جو دفعہ اوّل میں مذکور ہے۔

دفعہ ششم: راشی (رشوت گزار) اور دلّال (رشوت کا معاملہ طے کرنے والا) اور ہر وہ شخص جو جرائم مذکورہ میں شریک ہوگا وہ اُن سزاؤں کا مستحق ہوگا جو جرائم مذکورہ کے تحت بیان کی گئی ہے۔ ہر اُس شخص کو "شریکِ جُرم" قرار دیا جائے گا جس نے دانستہ تکمیلِ جرم تک مجرم کا ساتھ دیا ہو یا ترغیب دی ہو یا کوئی مدد کی ہو۔

دفعہ ہفتم: جو شخص قوّت یا تشدد یا تہدید سے کسی ملازم سے کوئی فیصلہ صادر کروائے گا یا کوئی اور خلافِ قانون کام کروائے گا یا اُسے فرائضِ منصبی کو حسبِ قانون سرانجام دینے میں مانع ہوگا وہ اُن سزاؤں کا مستوجب قرار پائے گا جو دفعہ اوّل میں بیان کی گئی ہیں۔

دفعہ ہشتم: جس شخص نے رشوت پیش کی مگر وہ قبول نہیں کی گئی یا طاقت یا تشدد یا تہدید کا استعمال کیا وہ مگر کارگر نہ ہوئی تو اُسے ۶ ماہ سے لے کر ۲ سال تک قید یا ۲½ ہزار سے لے کر ۵ ہزار ریال جرمانہ کی سزا یا بیک وقت دونوں سزائیں دی جاسکیں گی۔

دفعہ نہم: "سرکاری ملازمین" سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو سرکاری محکموں میں مستقل طور پر کام کرتے ہیں یا عارضی طور پر ان کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ سرکار کی طرف سے نامزد کردہ ماہرین اور کارکن بھی انہی میں شامل ہیں۔ نیز وہ ڈاکٹر اور نرسیں، جو اگرچہ باقاعدہ سرکاری ملازم نہ ہوں لیکن میڈیکل سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہوں اور حصہ دار کمپنیوں اور رفاہِ عامہ کے امور کی ذمہ دار ایجنسیوں کے کارندے اور گورنمنٹ کنٹریکٹر بھی اس قانون کے تحت ہوں گے۔

دفعہ دہم: جس شخص کو رشوت گزار (راشی)، یا رشوت گیر (مرتشی)، عطیہ وصول کرنے یا فائدہ اخذ کرنے کے لیے متعین کرتا ہے اور وہ جانتے بوجھتے اس خدمت کو سرانجام دیتا ہے تو اُسے ایک ماہ سے ۶ ماہ تک قید یا ایک ہزار سے ۵ ہزار تک جرمانہ کی سزا یا دونوں سزائیں دی جائیں گی لیکن شرط یہ ہے کہ یہ شخص دلال نہ ہو بلکہ محض کارندہ ہو۔

دفعہ یازدہم۔ اس قانون کی رُو سے ہر اُس "فائدہ" یا امتیاز" کو "عطیہ" یا "معاہدہ عطیہ" تصور کیا جائے گا جو رشوت گیر حاصل کر سکتا ہو۔ خواہ وہ کسی نام سے بھی موسوم ہو اور خواہ وہ مالی ہو یا اخلاقی۔

دفعہ دوازدہم: جو ملازمین مذکورۂ بالا جرائم میں سزایاب ہوں گے وہ حتماً ملازمت سے بھی برخاست سمجھے جائیں گے۔ اور آئندہ انہیں ہر سرکاری ملازمت سے محروم کیا جائے گا۔ نیز انہیں سرکاری ٹنڈر دینے، سرکاری نیلامی میں حصہ لینے، پبلک ورکس کے ٹھیکوں میں، خواہ وہ سرکاری ہوں یا لوکل باڈیز کے تحت ہوں، بلاواسطہ یا بالواسطہ شریک ہونے کے حق سے بھی محروم کر دیا جائے گا۔ البتہ کابینہ اس امر کی مجاز ہے کہ ۵ سال کے بعد کسی مخصوص شخص کی سزا پر نظر ثانی کرے۔

دفعہ سیزدہم: ہر جرم کی سزا میں علی حد الامکان وہ تمام مال بحق سرکار ضبط کر لیا جائے گا جو عطیہ یا رشوت کی غرض سے استعمال ہُوا ہو گا۔

دفعہ چہاردہم: رشوت دہندہ یا دلّال اگر خود جُرم کی اطلاع کر دے گا یا جُرم کا اقبال کریگا تو اُسے قید و جُرمانہ کی سزا سے معاف کیا جائے گا۔ اگر چہ یہ اطلاع یا اقبال بعد از وقوع جرم ہو۔ اور اگر یہ اطلاع یا اقبال جُرم قبل از وقوع جرم ہو گا تو اسے ضبطیٔ مال کی سزا سے بھی معاف کیا جائے گا۔

دفعہ پانزدہم: جو شخص جرائم مذکورہ میں سے کسی جُرم کی اطلاع بہم پہنچائے گا اور ثبوتِ جرم تک معلومات فراہم کرے گا اُسے سرکار کی جانب سے انعام دیا جائے گا بشرطیکہ وہ خود رشوت گزار یا حصہ دار یا دلّال نہ ہو۔ یہ انعام ۵ ہزار ریال سے کم اور ضبط شدہ مال کی نصف قیمت سے زیادہ نہ ہو گا۔ اگر ضبط شدہ مال کی مقدار انعام کی کم از کم مقدار کی متحمل نہ ہو گی تو یہ پوری رقم یا اس کا کچھ

حصہ سرکاری خزانہ سے دیا جائے گا۔

دفعہ شانزدہم: اگر کسی مقدمہ میں سرکاری ملازم کا بے قصور ہونا یا اُس کا سماج دشمن عنصر کا مقابلہ کرنا اور اُس کی حوصلہ شکنی کرنا ثابت ہوگا تو کابینہ لازماً مالی طور پر اُس کی حوصلہ افزائی کرے گی۔ اور دوسری مرتبہ ایسی صورت پیش آنے پر وہ اُسے استثنائی طور پر ترقی دے سکتی ہے۔

دفعہ ہفدہم: اس قانون میں بیان کردہ جرائم کی تفتیش کے فرائض محکمہ شکایات عامہ اور محکمہ پولیس کا ایک ایک نمائندہ کرے گا۔ کابینہ بھی اپنی طرف سے ایک نمائندہ شامل کر سکتی ہے۔ انکوائری رپورٹ ایک بورڈ کے سامنے پیش کی جائے گی جو محکمہ شکایات عامہ کے نگرانِ اعلیٰ یا اس کے نائب کی صدارت میں محکمہ شکایات عامہ کے ایک قانونی مشیر اور ایک کابینہ کی طرف سے نامزد کردہ قانونی مشیر پر مشتمل ہوگا۔ رپورٹ کا جائزہ لینے کے لیے ایسے کسی شخص کو شامل نہیں کیا جائے گا جو تفتیش میں شریک رہ چکا ہو یا کسی پہلو سے اپنی رائے صادر کر چکا ہو۔ بورڈ کا فیصلہ کابینہ کی توثیق کے بعد ناقابلِ اپیل ہوگا۔

تشریحی نوٹ: سرکاری نظم و نسق کو اختلال سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان افراد کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے جو اپنے منصب کا ناجائز استعمال کرتے ہیں یا اپنے اثر و رسوخ کی تجارت کرتے ہیں۔ یہ استعمال خواہ نفع اندوزی کی صورت میں ہو یا ضرر رسانی کی صورت میں۔ اور اثر و رسوخ خواہ حقیقی ہو یا فرضی۔ بہر حال سرکاری مشینری کا تحفظ اور عمومی مصالح کی حفاظت اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اُن کارندوں کا محاسبہ نہ کیا جائے جن کے ہاتھوں میں یہ مشینری ہوتی ہے۔ شریعتِ اسلامیہ نے منصب کے ناجائز استعمال اور بلا استحقاق اس سے استفادہ کرنے کی سختی سے روک تھام کی ہے۔ اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو شدید دنیاوی اور اُخروی سزاؤں کا مستحق ٹھیرایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا ایھا الذین اٰمنوا لا تأکلوا اموالکم	اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کے مال
بینکم بالباطل و تدلوا بھا الی الحکام	باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، اور نہ حاکموں کے آگے

لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون۔ (البقرہ: ۱۸۸)

ان کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ تمہیں دوسرے کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لعن اللہ الراشی والمرتشی و الرائش الذی یمشی بینھما

رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے اور دلال پر، جو دونوں کے مابین سودا چکاتا ہے، اللہ کی لعنت ہے۔

نیز فرمایا:

لعن اللہ الراشی والمرتشی فی الحکم۔

مقدمات کے فیصلوں میں رشوت لینے اور دینے والے پر خدا کی لعنت ہے۔

ابو حمید ساعدی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن اللتبیہ کو زکوٰۃ کا محصل مقرر فرمایا۔ جب وہ زکوٰۃ کا مال وصول کر کے واپس آیا تو کہنے لگا: "یہ مال آپ کا ہے اور یہ مجھے ہدیۃً ملا ہے" اس پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے اور فرمایا:

ما بال اقوام نستعملهم علی ما ولانا اللہ فیقول ھذا لکم وھذا اھدی لی فھلا جلس فی بیت ابیه فینظر أیھدی له ام لا۔

جن لوگوں کو ہم اپنے اُن کاموں پر عامل مقرر کرتے ہیں جو اللہ نے ہمارے سپرد کیے ہیں ان کا یہ کیا طریقہ ہے کہ وہ آکر کہتے ہیں کہ یہ مال تو تمہارا ہے اور یہ ہمیں ہدیہ میں ملا ہے۔ کیوں نہ وہ اپنے باپ کے گھر میں بیٹھے رہے۔ پھر دیکھتے کہ اُن کے پاس ہدیے آتے ہیں یا نہیں۔

الغرض تمام آسمانی شریعتیں بھی اور انسانی قوانین بھی رشوت کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اور ان تمام صورتوں کا انسداد کرتے ہیں جن کے ذریعہ یہ جرم پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ اسی غرض کے لیے یہ شاہی فرمان صادر ہوا ہے جس کی رُو سے رشوت خوری کی تمام صورتوں کا تعاقب کیا گیا ہے۔

اور ان کے قلع قمع کے لیے اور درپردہ سرگرمیوں سے پردہ اٹھانے کے لیے معقول انعامات مقرر کیے ہیں۔

معاشرتی تحفظ کا قانون

باب اوّل: گزارہ الاؤنس اور اس کے حصول کی شرائط

فصل اوّل: گزارہ الاؤنس کے مستحقین

دفعہ ۱۔ مندرجہ ذیل اشخاص معاشرتی تحفظ کے قانون کی رو سے، گزارہ الاؤنس کے مستحق ہوں گے بشرطیکہ ان کے اندر وہ شرائط پائی جاتی ہوں جو اس قانون میں واضح کر دی گئی ہیں۔

۱۔ یتیم: جس کا باپ نامعلوم یا لاپتہ ہو وہ بھی یتیم کے حکم میں شامل ہے۔

۲۔ مستقل معذور: عذر خواہ بڑھاپے کی وجہ سے ہو یا کسی اور جسمانی مرض یا عیب کی وجہ سے۔

۳۔ لاوارث عورت۔

دفعہ ۲۔ ہر وہ یتیم گزارہ الاؤنس کا مستحق ہوگا جس کی عمر ۱۸ سال سے زائد نہ ہوگی خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔

دفعہ ۳۔ ہر وہ بوڑھا شخص گزارہ الاؤنس کا مستحق ہوگا جس کی عمر ۶۰ سال سے متجاوز ہوگی اور طبی رپورٹ کی رو سے اس کی کارکردگی کی قوت سلب ہو چکی ہوگی۔

دفعہ ۴۔ بڑھاپے کے ماسوا دوسرے عذرات کی صورت میں ہر وہ شخص گزارۂ الاؤنس کا مستحق ہوگا جو میڈیکل سرٹیفکیٹ کی رو سے کام کے ناقابل ثابت ہو چکا ہوگا۔

دفعہ ۵: ہر لاوارث عورت گزارہ الاؤنس کی مستحق ہوگی جس کی عمر ۱۸ سال سے متجاوز ہوگی اور اس کا کوئی کفیل نہ ہوگا قطع نظر اس سے کہ وہ شادی شدہ ہے یا مطلقہ یا بیوہ۔

دفعہ ۶۔ مستحقین کو گزارہ الاؤنس اسی صورت میں دیا جائے گا جبکہ انہیں سرکاری رفاہ خانوں، کفالت گھروں اور یتیم خانوں میں جگہ نہ مل سکے گی۔ جو مستحقین ان اداروں میں داخل کیے جائیں گے وہ اس وقت تک گزارہ الاؤنس سے محروم رہیں گے جب تک وہ ان سے وابستہ ہیں۔

(باقی صفحہ ۱۲۴ پر)

اسلامی ریاست کی معاشی ذمّہ داریاں

(از جناب محمد نجات اللہ صدیقی ایم اے لیکچرار شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

(۲)

اس واقعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ معذور افراد کو خادم فراہم کرنا بھی اُسی اصول کے تحت آتا ہے جس اصول کے تحت بھوکے کو کھانا کھلانا۔

یہ بات کہ وہ بنیادی ضروریات کیا ہیں جن کی تکمیل کا اہتمام ضروری ہے، مقاصدِ شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے مذکورہ بالا آثار و احادیث کی روشنی میں طے کی جائے گی۔ غذا، لباس اور سر چھپانے کے لیے مکان ایسی ضروریات ہیں جن کی تکمیل نہ ہو تو آدمی کی جان چلی جانے کا اندیشہ ہے۔ یہی حیثیت مریض کے لیے علاج کی ہے۔ چونکہ قیامِ حیات، شریعت کے اولین مقاصد میں سے ہے لہٰذا ان چاروں ضروریات کی تکمیل کو لازماً کفالتِ عامّہ کے اصول میں شامل سمجھنا چاہیے۔

ان اہم ترین ضروریات کے علاوہ بعض اور ضروریات ہیں جن کو اس فہرست میں شامل کرنے پر غور کیا جا سکتا ہے۔ مذکورۂ بالا آثار میں معذور افراد کے لیے خادم فراہم کرنے کا ذکر آیا ہے۔ یہ ضرورت ایسی ہے کہ اگر معذور فرد اپنے اہلِ خاندان کے تعاون سے یا خود اپنے مال کے ذریعہ خادم رکھ کر گزارا نہ کر سکتا ہو تو معاشرہ کو اس کی یہ ضرورت پُوری کرنی چاہیے۔ اگر اسے نہ پُورا کیا گیا تو اس کے لیے زندگی گزارنا ممکن نہیں رہے گا۔ ہاتھ پاؤں سے معذور افراد، اندھے، مُزمن امراض میں مبتلا افراد کے لیے ایسے ادارے قائم ہونے چاہییں جہاں اُن کی خدمت اور دیکھ بھال کا اجتماعی طور پر انتظام ہو۔ ایسے ادارے معاشرہ میں افراد کے رضاکارانہ تعاون سے بھی قائم ہو سکتے ہیں اور ریاست کے زیرِ اہتمام بھی چلائے جا سکتے ہیں۔ بالآخر یہ ذمّہ داری اسلامی ریاست کی ہو گی کہ ہر معذور فرد کو کوئی مناسب سہارا مل جائے۔

اس ضرورت کو علٰحدہ سے شمار کرنے کی بجائے اسے علاج کے وسیع مفہوم میں شامل سمجھا جا سکتا ہے

ایک اور اہم ضرورت "تعلیم" کی ضرورت ہے۔ ہر مسلمان کے لیے اسلامی تعلیمات کا علم حاصل کرنا فرضِ عین ہے، اور اسلامی ریاست کے اہم ترین فرائض میں مسلمانوں کو اسلامی طرزِ زندگی کی تعلیم دینا شامل ہے۔ یہاں اس فرض سے بحث نہیں بلکہ اس بات پر زور دینا مقصود ہے کہ دورِ جدید میں ریاست اس فرض کو ادا کرنے میں اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب وہ اپنے شہریوں کی عام تعلیم یعنی پڑھنا اور لکھنا سکھانے کا اہتمام کرے اس کا اہتمام قرنِ اول کی اسلامی ریاست بھی کرتی تھی، جیسا کہ اوپر نقل کیے ہوتے آثار سے واضح ہوتا ہے۔

عام تعلیم ایک شعوری دینی زندگی اور کامیاب دنیوی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ پھر یہ دین کا علم حاصل کرنے کا ناگزیر ذریعہ بھی بن چکی ہے۔ اس کے ماسوا ہر جمہوری سماج کی طرح اسلام کے شورائی نظامِ حکومت کی صحت اور استحکام کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ عام شہری تعلیم یافتہ ہوں۔ عام شہری کو حکومت پر صحت مند تنقید کرنے، ملک کے مختلف مسائل میں اپنی رائے قائم کرنے اور مشاورت میں حصہ لینے کے لیے بغیر تعلیم کے نہیں تیار کیا جا سکتا۔ ان دلائل اور مصالح کے پیشِ نظر دورِ جدید کی ایک اسلامی ریاست کو اپنے شہریوں کی تعلیم کو بھی ان کی بنیادی ضروریات میں شامل سمجھنا چاہیے۔

مذکورہ بالا آثار میں دو اور ضرورتوں کا ذکر آیا ہے۔ مقروض افراد کے قرضوں کی ادائگی اور شادی کے قابل غریب افراد کو شادی کرنے کے لیے مالی امداد۔

مقروض افراد کو ادائے قرض کے لیے مالی امداد دینے کے بارے میں کوئی عام اصول وضع کرنا مشکل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے جس بات کا ثبوت ملتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اگر ریاست کے خزانہ میں، دوسری ضروریات کی تکمیل کے بعد گنجائش ہو تو وہ ان مرنے والوں کے قرضے ادا کرنے کی ذمہ داری لے لے جنھوں نے اتنا ترکہ نہ چھوڑا ہو جو ادائے قرض کے لیے کافی ہو۔ اس کے علاوہ قرض کے بارے پریشان افراد کو زکوٰۃ کے مال میں سے ادائے قرض کے لیے مالی امداد دی جانی چاہیے ان مخصوص حالات کے علاوہ ریاست پر بار نہیں ڈالا جا سکتا کہ وہ ہر

مقروض فرد کا قرض ادا کرے کیونکہ اس سے گوناگوں مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں، ماسوا اس بار کے جو ریاست کے خزانہ پر پڑے گا۔

غذا، لباس، مکان، علاج اور تعلیم کی جن بنیادی ضروریات کی تکمیل کو ہم نے بالآخر اسلامی ریاست کی ذمہ داری قرار دیا ہے ان کے سلسلہ میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان کی وہ کم سے کم مقداریں کیا ہیں جن کی فراہمی اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے ضروری سمجھی جائے گی۔ اس سوال کا اصولی جواب یہ ہے کہ غذا، لباس اور مکان کی ضرورتیں کم سے کم اس حد تک پوری کی جانی چاہییں کہ بھوک، پیاس، سردی یا گرمی کی شدت اور بارش وغیرہ کے نتیجہ میں فرد کی جان جانے کا اندیشہ نہ باقی رہے اور اس کے اندر اتنی طاقت بحال رہے کہ وہ کسبِ معاش کی جد و جہد کر سکے۔ اس اصولی بات سے آگے بڑھ کر اشیاء مطلوبہ کی کیفیت یا کمیت کے بارے میں کوئی صراحت کرنا دشوار ہے ان کی تعیین احوال و ظروف پر مبنی ہوگی۔ جہاں تک مریض کے علاج کا تعلق ہے ایسا انتظام کیا جانا چاہیے کہ محروم افراد ملک کی عام معاشی سطح کے مطابق ضروری طبی خدمات۔۔ اور دوائیں مفت حاصل کر سکیں تعلیم کم از کم اتنی ہونی چاہیے کہ ہر فرد پڑھنا اور لکھنا سیکھ لے۔ قرآن کا ناظرہ پڑھنا، اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقفیت، جاہلیت اور اسلام کے درمیان تمیز کی صلاحیت، اور عبادات کے طریقے اور عام معاملاتِ زندگی میں اسلامی حدود سے آگاہی ابتدائی اسلامی تعلیم کے لازمی معیار میں شامل ہیں ظاہر ہے کہ اس کم سے کم سطح سے آگے بڑھ کر دینی اور دنیوی علوم و فنون کی اچھی سے اچھی تعلیم دینا ہر ریاست کا مطمح نظر ہونا چاہیے۔ لیکن ہم یہاں صرف کم سے کم اور لازمی معیار پر گفتگو کر رہے ہیں۔

یہ سوال بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ ریاست یہ انتظامات عملاً کس طرح کرے گی۔ اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ افراد انتظامات سے بے جا اور بغیر استحقاق فائدہ نہیں اٹھائیں گے یا کاہلی اور بے عملی کے ذریعہ خود کو محروم بنانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ لیکن جدید متمدن ممالک اور موجودہ فلاحی ریاستوں (WELFARE STATES) کے تجربوں کی روشنی میں ان مسائل کا حل بآسانی ممکن ہے۔۔ ان

انتظامات سے بے جا فائدہ اٹھانے کا سدّباب اخلاقی تربیت، رائے عامہ کے دباؤ اور تعزیری سزاؤں کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ قابلِ کار محروم افراد کو ان ضروریات کی تکمیل کے پہلو بہ پہلو کام کرنے پر بھی مجبور کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ معاشرتی ترقی کا اہتمام | کفالت عامّہ کی طرح ملک کی معاشی تعمیر و ترقی بھی ایک اجتماعی فریضہ ہے اگر کفالتِ عامّہ سے ہر فرد کی ضروریات کی تکمیل اور قیامِ حیات وابستہ ہے تو معاشی تعمیر و ترقی سے پورے اجتماع کا قیام و بقاء اس کی قوت کا استحکام اور اس کی جملہ دنیوی مصالح وابستہ ہیں جن کا تحفظ ریاست کو وجود میں لانے کا ایک اہم سبب ہے۔ یہ ذمہ داری اگرچہ افراد پر ان کی انفرادی حیثیتوں میں بھی عائد ہوتی ہے لیکن اجتماع کے نمائندہ صاحبِ اقتدار ادارہ ریاست پر اس کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔

کسی ملک کی معاشی تعمیر و ترقی اس ملک کی فوجی طاقت اور دفاعی قوت کی بنیاد اور اس کے سیاسی استحکام کی لازمی شرط ہے۔ آج کل دفاعی قوت براہِ راست صنعتی ترقی سے وابستہ ہے۔ محفوظ دفاعی پالیسی کا ایک مسلّمہ اصول یہ ہے کہ ملک اہم دفاعی سامانوں کے لیے دوسرے ممالک بالخصوص کسی دوسرے تہذیبی بلاک سے تعلق رکھنے والے ممالک کا محتاج نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جدید آلاتِ حرب اور دفاعی سامان کسی ملک میں اسی وقت تیار کیے جا سکتے ہیں جب وہ صنعتی ترقی کے ایک اونچے معیار تک پہنچ چکا ہو۔ یہ بات محتاجِ دلیل نہیں کہ قرآن و سنّت میں دارالاسلام کی فوجی طاقت اور دفاعی قوت کے استحکام پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ

وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ (انفال-۶۱) اور اُن کے لیے جتنی قوت تم سے ممکن ہو سکے فراہم کر رکھو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ کی مختلف فوجی تیاریوں، تیر اندازی اور گھوڑ سواری کی مشق اور اسلحہ اور گھوڑے فراہم کر رکھنے پر صحابۂ کرام کو برابر ابھارتے رہتے تھے۔ آج کی فوجی تیاریاں اور قوّت کے ذرائع مختلف ہیں۔ آج اسی حکم اور انہی ارشاداتِ نبوی کا منشاء یہ ہے کہ زمانہ کے

معیار کے مطابق فوجی قوت پیدا کی جائے اور تیاریاں کی جائیں۔ چونکہ یہ مقصد صنعتی ترقی اور فولاد، ایٹمی توانائی، اور بجلی کی طاقت جیسی بنیادی صنعتوں کے فروغ کے بغیر نہیں حاصل کیا جاسکتا اس لیے ان چیزوں کا اہتمام بھی لازم قرار پائے گا۔ کسی شرعی فریضہ کی ادائیگی اگر کسی مباح کام پر موقوف ہو تو وہ کام بھی فرض ہو جاتا ہے۔

معاشی تعمیر و ترقی کا اہتمام فقر و فاقہ کے انسداد اور کفالتِ عامّہ کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ قومی پیداوار میں اضافہ کی موثر تدابیر نہ اختیار کی جائیں تو صرف موجودہ دولت کی ازسرِ نو تقسیم کے ذریعہ کسی ملک کے ہر فرد کو ایک معقول معیارِ زندگی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ اس نکتہ پر غور کرتے وقت یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ آج مسلمان ممالک جن میں اسلامی ریاست کے قیام کا امکان ہے، معاشی طور پر پس ماندہ اور کم ترقی یافتہ ہیں۔ ان کی قومی پیداوار کی موجودہ سطح ان کی بڑھتی ہوئی آبادیوں کے لیے ناکافی ہے۔ اور وہ صرف یہ طریقہ اختیار کر کے کفالتِ عامّہ کی ذمہ داری نہیں ادا کر سکتے کہ امیر لوگوں سے ان کی دولت کا ایک حصّہ لیکر اہلِ حاجت کے درمیان تقسیم کر دیں۔

دورِ جدید کی ایک اسلامی ریاست اپنی تہذیبی انفرادیت کو بھی اسی وقت برقرار رکھ سکتی ہے جب وہ صنعتی طور پر غیر مسلم دنیا سے بڑی حد تک بے نیاز ہو جائے اور کم از کم ضروری سامانِ زندگی کے لیے ان ممالک کی محتاج نہ ہو۔ جو ممالک صنعتی طور پر دوسرے ملکوں پر بہت زیادہ انحصار کرتے ہیں وہ تہذیبی طور پر بھی ان کا اثر قبول کرنے لگتے ہیں۔ اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ آج اسلامی ممالک کی صنعتی پس ماندگی اور مغرب کی محتاجی ان پر مغربی تہذیب کے اثر اور مغربی غلبہ و استیلاء کا ایک اہم سبب ہے۔ ایک اسلامی ریاست کے سامنے صرف یہی مقصد نہ ہوگا کہ وہ تہذیبی طور پر ممتاز اور اجنبی تہذیبوں کے اثرات سے محفوظ رہے۔ بلکہ اُسے تہذیب اور نظریات کے میدان میں ایک فعّال، داعیانہ کردار اختیار کرنا ہے۔ داعی کی حیثیت دینے والے کی ہونی چاہیے نہ کہ دستِ سوال دراز کرنے والے کی یہ اسی وقت ممکن ہے جب دارالاسلام صنعتی ترقی کے میدان میں اگر دوسرے

ملکوں سے آگے نہیں تو ان سے بہت پیچھے بھی نہ ہو۔

قرنِ اوّل کی اسلامی ریاست نے موقع پڑنے پر غیر مسلم دنیا کی تالیفِ قلب کے لیے اس کو مالی اور مادّی امداد بھی دی ہے کیونکہ تالیفِ قلب اسلام کے داعیانہ پروگرام کا ایک مستقل جزو ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ میں قحط کے زمانہ میں پانچ سو اشرفی نقد اور ضروری اجناس بھیج کر مدد کی تھی۔ آج جبکہ تہذیبی کشمکش اور نظریاتی جنگ میں بیرونی امداد اور بین الاقوامی معاشی تعاون کو ایک اہم مقام حاصل ہو چکا ہے۔ ایک اسلامی ریاست کے پاس اتنے وسائل ہونے چاہییں کہ وہ اپنی دعوت کے لیے راہ ہموار کرنے کی خاطر ان ذرائع کو استعمال کر سکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب دارالاسلام معاشی طور پر ترقی یافتہ ہو۔

ان دلائل کی روشنی میں ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ ایک اسلامی ریاست کی ذمّہ داری ہے کہ وہ اپنے ملک کی معاشی تعمیر و ترقی کا اہتمام کرے۔ اوپر ہم لکھ چکے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحبِ امر کو مسلمانوں کے ساتھ ہر ممکن خیر خواہی کرنے کا حکم دیا ہے۔ ظاہر ہے اس خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ ریاست ملک کی معاشی تعمیر و ترقی کے لیے مناسب اقدامات کرے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور ایک حدیث قدسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی خوش حالی کا اہتمام اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ امام سرخسی لکھتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک اثر منقول ہے جس میں وہ اپنے پروردگار عزّ وجلّ کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں کہ :۔

عمّروا بلادی فعاش فیہا	انہوں نے میرے ملکوں کو آباد کیا جن میں میرے
عبادی [1]	بندے زندگی بسر کرتے رہے۔

اسی بنا پر اسلامی مفکرین نے ملک کی خوش حالی کے اہتمام کو اسلامی ریاست کے صدر کی ذمّہ داری قرار دیا ہے۔ ماوردی نے امام کے فرائض گناتے ہوئے لکھا ہے :

والذی یلزم سلطان الامۃ سبعۃ	اُمّت کے حکمران پر سات ذمہ داریاں عائد

[1] سرخسی: المبسوط جلد ۱۰ صفحہ ۹۱-۹۲ [2] سرخسی: المبسوط جلد ۲۳ صفحہ ۱۵

اشیاء	ہوتی ہیں . . . .
والثالث عمارة البلدان باعتقاد مصالحها وتهذيب سبلها ومسالكها[1]	ان میں سے تیسری ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے زیر حکومت) ممالک کے جملہ مصالح کے تحفظ اور اس کی شاہراہوں اور دوسرے ذرائع نقل وحمل کو بہتر بنا کر ان ممالک کو آباد و خوش حال رکھے۔

ماوردی نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ملک کو آباد و خوش حال رکھنے کے کام کی قدر و قیمت کیا تھی۔

قال ابو هريرة سبت العجم بين يدي رسول الله صلى الله عليه وسلم فنهى عن ذالك وقال لا تسبوها فانها عمرت بلاد الله تعالى فعاش فيها عباد الله تعالى[2]	ابوہریرہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اہل عجم کو برا کہا گیا تو آپ نے ایسا کرنے سے منع کیا اور فرمایا: ان کو برا نہ کہو کیونکہ ان لوگوں نے اللہ کے ملکوں کو آباد اور خوش حال بنایا تو ان میں اللہ تعالیٰ کے بندوں نے زندگی گزار دی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ملک کو خوش حال رکھنے اور ترقی دینے کا اہتمام کرتے تھے۔ آپ نے والیٔ مصر حضرت عمرو بن العاص کو خط لکھا تھا کہ مقوقس سے دریافت کریں کہ مصر کی خوش حالی اور بربادی کا انحصار کن عوامل پر ہے۔ آپ نے انھیں تاکید کی تھی کہ ایسی تدابیر اختیار کریں جن سے خوش حالی میں اضافہ ہو۔[3] حضرت عمرو بن العاص نے حضرت عمرؓ کے سامنے یہ تجویز بھی رکھی کہ اگر بحیرۂ روم اور بحیرۂ قلزم کو ایک نہر کے ذریعے ملا دیا جائے تو مدینہ میں بحیرۂ روم کے اردگرد کے زرخیز علاقوں سے غلہ کی درآمد آسان ہو جائے گی اور وہاں غلہ کا نرخ ارزاں رہا کرے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو لکھا کہ اس تجویز پر فوراً عمل کیا جائے۔ چنانچہ یہ نہر کھودی گئی اور

---

[1] ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب البصری الماوردی: ادب الدین والدنیا مطبعۃ دار الکتب العربیۃ الکبریٰ مصر طبع اول صفحہ ۸۲ [2] ایضاً صفحہ ۸۱

[3] ابن عبدالحکم بحوالہ کنز العمال جلد ۳ نمبر ۲۴۰۰

جب تک یہ نہر قائم رہی مدینہ کو دوبارہ غذائی قلت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس سے خود مصر کی خوش حالی میں بھی اضافہ ہوا۔[1]

آپ ہی کے حکم سے بصرہ کے والی حضرت ابوموسیٰ اشعری نے ایک نہر کھدوائی تھی جو نہر ابلہ کے نام سے مشہور ہوئی۔[2] اسی طرح انبار کے زمینداروں کی فرمائش پر حضرت سعد بن ابی وقاص کے حکم سے ایک نہر کی تعمیر شروع ہوئی جسے بعد میں حجاج بن یوسف نے مکمل کرایا۔[3] حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بصرہ میں نہر ابن عمر کھدوائی۔[4] نہروں کی تعمیر کا جو سلسلہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور سے شروع ہوا وہ بعد میں بھی جاری رہا۔[5] اگر یہ حقیقت سامنے رہے کہ قرنِ اوّل اور اس کے بعد ان ادوار میں اسلامی ممالک کی معیشت ایک زرعی معیشت تھی تو نہروں کی تعمیر کی معاشی اہمیت کا پوری طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

نہروں کی تعمیر کے علاوہ حسب ضرورت سیلاب کی روک تھام کے لیے بند بھی تعمیر کروائے گئے چنانچہ حضرت عمرؓ نے مکہ میں اس مقصد کے لیے ایک بند تعمیر کروایا۔[6]

اپنی رعایا کے لیے وسائلِ زندگی میں فراوانی بہم پہنچانا حضرت عمر کی مالی پالیسی کا ایک اہم اصول تھا۔ اس کا اعلان آپ نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں ان الفاظ میں فرما دیا تھا۔

ولیس اجعل امانتی الی احدٍ
لیس لھا باھلٍ ولکن اجعلھا الی من
تکون رغبتہ فی التوفیر للمسلمین
اولئک احق بھم من سواھم۔[7]

میں اپنی امانت (یعنی حکومت کے عہدے) ایسے افراد کے سپرد نہیں کروں گا جو اس کے اہل نہ ہوں بلکہ ایسے افراد کے سپرد کروں گا جو مسلمانوں کے لیے فراوانی بہم پہنچانا چاہتے ہوں۔ دوسروں کی بہ نسبت ایسے افراد مسلمانوں کی حکمرانی کے زیادہ حق دار ہیں۔

---

[1] طبری: تاریخ بحوالہ بالا صفحہ ۲۵۷۷ (حوادث ۱۸ھ) [2] بلاذری: فتوح البلدان طبع قاہرہ صفحہ ۳۵۱ [3] ایضاً صفحہ ۲۷۳ [4] ایضاً صفحہ ۳۶۴۔
[5] ایضاً صفحہ ۲۵۳ تا ۳۶۵ اور صفحہ ۲۷۳ و ۲۷۴ [6] ایضاً صفحہ ۶۵
[7] موطا امام مالک۔

آپ مسلمانوں کی خیر خواہی کا تقاضا سمجھتے تھے کہ انہیں زیادہ سے زیادہ مال دیا جائے اور انہیں مشورہ دیتے تھے کہ فوری ضروریات سے جو مال فاضل ہو اسے نفع آور کاروبار میں لگائیں تاکہ وہ آئندہ مستقل آمدنی کا ذریعہ بنے۔

قدم خالد بن عرفطة العذری علی عمر فسأله عمر عما وراءه فقال تركتهم يسألون الله لك ان يزيد فی عمرك من اعمارهم ما وطیٔ احد القادسية الا وعطاؤه الفان او خمس عشرة مائة وما من مولود ذكرا كان او انثى الا والحق فی مائة وجريبين فی كل شهر۔

خالد بن عرفطہ عذری عمرؓ کے پاس آئے تو عمرؓ نے اُن سے دریافت کیا کہ جہاں سے آرہے ہو وہاں لوگوں کا کیا حال ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں انہیں اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ وہ اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ان کی عمروں میں سے کچھ مدت کم کر کے آپ کی عمر میں اضافہ کر دے۔ جس نے بھی قادسیہ میں قدم رکھا تھا اس کا وظیفہ دو ہزار یا پندرہ سو درہم سالانہ ہے۔ ہر بچے کے لیے خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی، پیدا ہوتے ہی سو درہم اور دو جریب (غلہ) ماہانہ مقرر ہو جاتا ہے۔

قال عمر: انما هو حقهم۔ وانا اسعد باداته اليهم۔ لو كان من مال الخطاب ما اعطيتموه۔ ولكن قد علمت ان فيه فضلا۔ فلو انه اذا خرج عطاء احد هؤلاء ابتاع منه غنما فجعلها بسوادهم فاذا خرج عطاءه ثانية ابتاع الرأس والرأسين فجعله فيها فان بقی احد من ولده كان لهم۔

عمرؓ نے کہا: یہ اُن کا حق ہے، میں اسے انہیں دے کر اپنا بھلا کر رہا ہوں۔ اگر یہ خطاب کا مال ہوتا تو تمہیں نہ دیا جاتا۔ البتہ میں یہ جانتا ہوں یہ مال ضرورت سے زائد ہوتا ہے کیا ہی اچھا ہوتا اگر لوگ ایسا کرتے کہ جب کسی کو وظیفہ ملے تو اس میں سے کچھ بھیڑ بکریاں خرید کر اپنے زرخیز زرعی علاقہ میں چھوڑ دے پھر جب دوسرے سال کا وظیفہ ملے تو ایک یا دو غلام خرید کر ان کو بھی اسی علاقہ میں کام پر لگا دے اگر ان کی اولاد میں کوئی باقی رہا تو اس طرح اس کے لیے ایک قابلِ اعتماد سہارا قائم ہو جائیگا کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ میرے بعد کیا ہوگا۔

شئی قد اعتقدوہ فانی لاادری ما یکون بعدی وانی لا عنۃ بنصیحتی من طوقنی اللہ امرہ فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من مات غاشاً لرعیتہ لم یجد رائحۃ الجنۃ [1]	میں تو ہر اس فرد کے ساتھ پوری خیر خواہی کرتا ہوں جس کے امور کا اللہ نے مجھے نگران بنایا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو اپنی رعیت کے ساتھ بدخواہی اور خیانت کرتا ہوا مرے گا وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پاسکے گا۔

دوسرے خلیفۂ راشد کے اس اثر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب امر کو عامۃ المسلمین کے ساتھ جس خیر خواہی کی تائید کی ہے اس کا تصور کتنا وسیع ہے اگر صاحب امر رعایا کی مادی فلاح و بہبود کے اہتمام میں کوئی کسر اٹھا رکھے تو حضرت عمر کے نزدیک یہ بھی بدخواہی (غش) ہوگی اور ایسا کرنے والا آخرت میں جنت سے محرومی کا خطرہ مول لے گا۔

خلفاء کو اس بات کی بڑی فکر رہتی تھی کہ اشیاء ضرورت کے نرخ ارزاں ہیں چنانچہ وہ مختلف علاقوں کے نرخ معلوم کرتے رہتے تھے اور اگر انھیں یہ خبر ملتی کہ نرخ ارزاں ہیں تو اطمینان کا اظہار کرتے تھے سلمہ بن قیس اشجعی کا قاصد عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے دریافت کیا کہ اشیاء کے نرخ کیسے ہیں۔ قاصد نے جواب دیا کہ بہت ارزاں ہیں۔ آپ نے دریافت کیا کہ گوشت کا کیا نرخ ہے کیونکہ یہی عرب کا اصل سہارا ہے۔ تو قاصد نے آپ کو گائے اور بکری کے گوشت کے نرخ الگ الگ بتائے [2]۔

یہی طریقہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا رہا۔

عن موسیٰ بن طلحۃ قال سمعت عثمان بن عفان وھو علی المنبر والموذن یقیم الصلوۃ وھو یستخبر الناس یسأل عن اخبارھم واسعارھم [3]	موسیٰ بن طلحہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا ہے: "میں نے عثمان بن عفان کو منبر پر بیٹھ کر جب کہ مؤذن نماز کے لیے اقامت کہہ رہا تھا، لوگوں سے ان کے حالات خبریں اور اشیاء کے نرخ دریافت کرتے سنا ہے"۔

---

[1] بلاذری فتوح البلدان صفحہ ۴۳۹
[2] طبری تاریخ صفحہ ۲۷۱۹ حوادث ۲۲ھ
[3] مسند احمد۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے والیوں کو تاکید کرتے تھے کہ بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے کی تدابیر اختیار کریں[1]۔ آپ نے عراق کے والی کو یہ بھی لکھا تھا کہ بیت المال کے فاضل مال میں سے کاشتکاروں کو زرعی اغراض کے لیے قرض دیئے جائیں[2]۔

امام ابویوسف نے خلیفہ ہارون الرشید کو مشورہ دیا تھا کہ :

"میری رائے میں آپ خراج کے افسران کو ہدایت کر دیں کہ جب ان کی عملداری کے کچھ لوگ اُن کے پاس آکر یہ بتائیں کہ ان کے علاقہ میں بہت سی قدیمی نہریں ہیں جو اب ناکارہ ہو گئی ہیں اور بہت سی زمینیں زیر آب آگئی ہیں، اور اگر ان نہروں کو درست کرا دیا جائے اور ان کی کھدائی کر کے اُن میں پانی جاری کر دیا جائے تو یہ ناکارہ زمینیں آباد کر لی جائیں گی اور اس طرح خراج کی آمدنی میں بھی اضافہ ہو جائے گا تو اس کی اطلاع آپ کو لکھ بھیجی جائے پھر آپ کسی معتمد علیہ، امانت دار، صاحبِ صلاح و تقویٰ آدمی کو اس بارہ میں جائزہ لینے کے لیے بھیجیں۔ یہ آدمی اس علاقہ کے ثقہ، واقف کار اور صاحبِ بصیرت لوگوں سے معلومات حاصل کرے اور اس علاقہ کے باہر کے تجربہ کار اور صاحب رائے افراد سے بھی مشورہ کرے یہ افراد ایسے ہوں جو خود اس کام کے ذریعہ کوئی نفع حاصل کرنے یا اپنے کسی نقصان کی تلافی کے متمنی نہ ہوں۔ اگر سب کی رائے یہی ہو کہ اس اسکیم کو زیرِ عمل لانے میں ملک کا فائدہ ہے اور خراج کی آمدنی میں اضافہ کی توقع ہے تو آپ ان نہروں کی کھدائی کا حکم دے دیجیے اور اس کے سارے مصارف کا بار بیت المال پر ڈالیے۔ ان اخراجات کا بار اس علاقہ کے باشندوں پر نہ ڈالیے۔ ان لوگوں کا آباد و خوش حال رہنا ان کے اُجڑ جانے اور مفلس ہو کر ادائے خراج سے عاجز رہنے سے بہتر ہے۔ اپنی زمینوں اور نہروں کے سلسلہ میں اہلِ خراج کے ہر اس مطالبہ کو پورا کرنا چاہیے جس سے ان کے مفادات و مصالح کی ترویج ہوتی نظر آئے بشرطیکہ اس اسکیم پر عمل کرنے سے گرد و پیش کے دوسرے گاؤں اور قصبات کو نقصان پہنچنے

---

[1] ابویوسف : کتاب الخراج ص ۱۰۲ [2] ابو عبید کتاب الاموال ص ۲۵۱

کا اندیشہ نہ ہو۔ اگر ان کی تجویز پر عمل سے دوسروں کی پیداوار کم ہوجانے اور خراج کی آمدنی میں کمی ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کو نہیں منظور کرنا چاہیے۔

باشندگانِ سواد کو اگر اپنی اُن بڑی نہروں کی کھدائی اور صفائی کی ضرورت پیش آئے جو دجلہ اور فرات سے نکالی گئی ہیں تو آپ ان کی کھدائی اور صفائی کروا دیا کیجیے، اور اس کے مصارف کا بار بیت المال اور اہلِ خراج دونوں پر ڈالیے لیکن سارا بار اہلِ خراج ہی پر ڈال دینا صحیح نہ ہوگا . . . . دجلہ اور فرات اور دوسرے بڑے دریاؤں پر گھاٹ یا پانی کے نکاس کی جگہوں کی تعمیر اور مرمت پر آنے والے مصارف کا پورا بار بیت المال پر ڈالا جائے۔ اہلِ خراج پر اس سلسلہ میں کوئی بار نہ ڈالا جائے کیونکہ یہ سارے مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے کام ہیں اور ان کے مصالح کا تحفظ تمام تر امام کی ذمہ داری ہے[1]

ان نظائر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ابتدائی دور کی اسلامی ریاست زراعت کی ترقی کے لیے ہر طرح کا اہتمام کرتی تھی۔ اس بات کی کوشش کی جاتی تھی کہ قابلِ کاشت زمینیں بے کار پڑی رہیں۔ بنجر اور اُفتادہ زمینوں کو قابلِ کاشت بنایا جائے اور آبپاشی کے لیے نہریں تعمیر کی جائیں۔ اس دور کی معیشت ایک زرعی معیشت تھی۔ دورِ جدید کی طرح صنعت کو فروغ نہیں حاصل ہوا تھا۔ زراعت کی ترقی کے اہتمام کے پہلو بہ پہلو اشیاءِ ضرورت کے نرخ ارزاں رکھنے کی بھی فکر کی جاتی تھی۔ ان باتوں سے اسلامی ریاست کے اس عام رجحان کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی رعایا کی معاشی فلاح و بہبود کا اہتمام کرتی ہے اور ملک کی معیشت کو ترقی دینا چاہتی ہے۔ دورِ جدید کے حالات میں اس رجحان کے پیشِ نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی ریاست کو ملک کے قدرتی وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ترقی کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کرنی چاہییں۔ افراد کو ترقیاتی کاموں کی ترغیب دینے اور اس سلسلہ میں اُن کی مالی امداد کرنے کے ساتھ ریاست کو اس کام میں براہِ راست بھی حصہ لینا چاہیے معدنی وسائل

---

[1] ابو یوسف: کتاب الخراج ص ۱۳۱، ۱۳۲۔

کو ترقی دے کر کام میں لانا، دریاؤں کے پانی سے بجلی کی طاقت حاصل کرنا اور آب پاشی کے لیے بند تعمیر کرنا اور ملک کی زرعی اور صنعتی ترقی کے لیے دوسرے موزوں اقدامات کرنا دورِ جدید کی ایک اسلامی ریاست کے پروگرام میں اسی طرح شامل ہونا چاہیے جس طرح ابتدائی اسلامی ریاستوں کے پروگرام میں زرعی ترقی کا اہتمام شامل تھا۔

۳۔ تقسیم دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنا: قرآن و سنت اور خلافتِ راشدہؓ کے نظائر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا ایک رہنما اصول یہ بھی ہے کہ معاشرہ میں تقسیم دولت کے اندر جو تفاوت پایا جاتا ہے وہ کم ہو اور سماجی دولت کسی ایک طبقہ کے اندر مرکوز ہو کر نہ رہ جائے۔ مکی دور میں ہی مسلمانوں پر یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ دولت مند افراد کے مال میں دولت سے محروم افراد اور ضرورت سے مجبور ہو کر دستِ سوال دراز کرنے والوں کا بھی حصّہ ہے۔

وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (ذاریات: ۱۹)	اور ان کے اموال میں سائل اور محروم افراد کا بھی حق ہے۔

پھر مدنی دور میں جب بنو نضیر نامی یہودی قبیلہ کو ان کی بد عہدی اور اسلام دشمنی کی وجہ سے جلا وطن کیا گیا اور ان سے حاصل ہونے والے اموال کی تقسیم کا مسئلہ سامنے آیا تو یہ حکم نازل کیا گیا کہ یہ اموال ضرورت مند لوگوں کے لیے ہیں۔ اس حکم کی مصلحت یہ بتائی گئی کہ مال کو سماج کے دولت مند افراد کے درمیان مرکوز نہیں ہونا چاہیے۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَیْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ۔ (الحشر: ۷)	ان آبادیوں کو جن کے اموال کو اللہ نے اپنے رسول کو عطا کیا ہے وہ اللہ، اس کے رسول اور رسول کے قرابت داروں نیز یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے لیے مخصوص ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ مال و دولت تمہارے صاحب ثروت لوگوں ہی کے درمیان چکر کھاتی رہ جائے۔

اس آیت سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ مال و دولت کو اغنیاء کے درمیان گردش کرتے

رہ جانے سے روکنا اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا ایک مقصد ہے۔ اسی آیت سے یہ بات بھی واضح ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے قانونِ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے مناسب اقدام بھی کیے جاسکتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تقسیمِ دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کا مقصد اسلامی ریاست نے تین طریقوں سے حاصل کیا۔ ہر سال زکوٰۃ اور عُشر کے ذریعہ دولت مندوں کے مال کا ایک حصہ غریبوں کی طرف منتقل کیا جاتا رہا۔ فے کے مال کو غریبوں کے درمیان تقسیم کیا گیا اور اصحابِ دولت کو ترغیب و تلقین کے ذریعہ اس بات پر اُبھارا گیا کہ وہ اہلِ حاجت کی مالی امداد کریں۔

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور فئے کا مال آیا تو آپؓ نے اسے عوام کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کر دیا اور چھوٹے بڑے، آزاد، غلام، مرد اور عورت سب کو برابر کا حصہ دیا۔ جب بعض لوگوں نے آپ سے یہ کہا کہ خدمتِ اسلام اور اسلام لانے میں سبقت کی بنا پر بعض کو بعض سے زیادہ حصہ دینا چاہیے تو آپ نے اس کا جواب یہ دیا کہ:

اما ما ذکرتم من السوابق والقدوم والفضل فما اعرفنی بذلك وانما ذلك شئ ثوابه علی الله جل ثناءه۔ وھذا معاش فالاسوۃ فیه خیر من الاثرۃ[1]	"تم نے جو سابقیت، اولیت، اور فضیلت کا ذکر کیا ہے تو میں اس سے بہت اچھی طرح واقف ہوں لیکن یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا ثواب اللہ جل ثناءہ کے ذمہ ہے مگر یہ معاملہ معاش کا ہے۔ اس میں مساوات کا برتاؤ ترجیحی سلوک سے بہتر ہے۔"

ایک دوسری روایت:۔

"ان ابا بکر کلم فی ان یفضل بین الناس فی القسم۔ فقال: فضائلھم عند الله، فاما ھذا المعاش فالتسویة فیه خیر"[2]	ابوبکرؓ سے کہا گیا کہ وہ فئے کی تقسیم میں بعض لوگوں کو بعض پر ترجیح دیں تو آپؓ نے فرمایا: "ان کے فضائل کا اعتبار اللہ کے یہاں ہوگا۔ جہاں تک اس معاشی زندگی کا سوال ہے اس میں برابر کا سلوک کرنا بہتر ہے۔"

---

[1] ابو یوسف: کتاب الخراج ص ۵۰ [2] ابو عبید: کتاب الاموال ص ۲۶۳

خلیفہ اوّل کا یہ ارشاد اگرچہ فے کی تقسیم سے متعلق ہے لیکن آخری جملہ میں آپ نے ایک اصولی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے جس سے اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا عام رجحان اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یہ عام رجحان یہ ہے کہ وسائل معاش کی تقسیم میں تفاوت کے بجائے مساوات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

تقسیم دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کے باقی دو طریقے، جو عہد نبوی میں اختیار کیے گئے تھے، عہدِ صدیقی میں بھی نافذ رہے۔ جب بعض قبائل نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو ریاست نے ان کے خلاف فوجی کارروائی کر کے ان کو اس حق کی ادائیگی پر مجبور کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اس اصول کے مطابق عمل کی اہم ترین مثال وہ پالیسی ہے جو عراق و شام کی مفتوحہ زمینوں کو فوجیوں کے درمیان تقسیم نہ کرنے کے فیصلہ کا باعث بنی۔ پہلے حضرت عمرؓ بعض صحابہ کے اس مشورہ کی طرف مائل ہو گئے تھے کہ یہ زمینیں فوجیوں کے درمیان تقسیم کر دی جائیں۔ لیکن بعد میں جب آپ کی توجہ اس طریقے کے بُرے نتائج کی طرف مبذول کرائی گئی تو آپ نے مزید غور کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو آیاتِ فے (سورۂ حشر آیات ۶ تا ۱۰) کا ایسا فہم عطا کیا کہ آپ نے اس تجویز کو مسترد کر دیا اور ان زمینوں کو سارے مسلمانوں کی ملکیت قرار دینے کا فیصلہ کیا۔

قدم عمر الجابية فاراد قسم الارض بين المسلمين۔ فقال معاذ والله اذن ليكونن ما تكره۔ انك ان قسمتها صار الريع العظيم في ايدي القوم، ثم يبيدون فيصير ذلك الى الرجل الواحد او المرأة، ثم يأتي من بعدهم قوم يسدون من الاسلام مسدًّا، وهم لا يجدون شيئًا فانظر امرًا يسع

عمر جابیہ آئے تو انھوں نے زمین کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرنے کا ارادہ کیا۔ معاذ نے آپ سے کہا خدا کی قسم پھر تو وہی ہوگا جو آپ کو ناپسند ہے اگر آپ نے زمین کو تقسیم کیا تو بڑے بڑے علاقے ان (موجودہ) لوگوں کو مل جائیں گے پھر یہ مر جائیں گے تو یہ زمینیں (وراثت کے ذریعہ) کسی ایک آدمی یا عورت کے ہاتھ میں آجائیں گی پھر ان کے بعد دوسرے لوگ (اسلام میں داخل ہو کر) آئیں گے جو اسلام کا دفاع کریں گے مگر ان کو کچھ نہ مل سکے گا۔ آپ غور و فکر کے بعد کوئی ایسا طریقہ اختیار کیجیے جو آج کے مسلمانوں کے لیے بھی موزوں ہو اور

اولهم و اخرهم	بعد میں آنے والوں کے لیے بھی مفید ہو۔
قال هشام : وحدثني الوليد بن مسلم عن تميم بن عطية عن عبد الله بن ابي قيس۔ او ابن قيس :۔ انه سمع عمر يكلم الناس في قسم الارض ۔ ثم ذكر كلام معاذ اياه ۔ قال فصار عمر الى قول معاذ[1]	(حدیث کے راوی) ہشام نے کہا : مجھ سے ولید بن مسلم نے بروایت تمیم بن عطیہ بروایت عبداللہ بن ابی قیس یا ابن قیس۔ حدیث بیان کی ہے کہ انھوں نے عمر کو زمین کی تقسیم کے بارے میں لوگوں سے (مشورۃً) گفتگو کرتے سنا۔ پھر راوی نے اس بات کا ذکر کیا جو معاذ نے عمر سے کہی ۔ راوی کہتا ہے کہ پھر عمر نے معاذ کی بات مان لی۔

حضرت معاذؓ بن جبل نے زمینوں کی تقسیم کے خلاف رائے دیتے وقت جو بات فرمائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت عمر کو سماج میں دولت کا ارتکاز ناپسند تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ زمین کی ملکیت ایک محدود طبقہ میں گھر کر رہ جائے اور باقی افراد اس سے محروم رہیں۔ حضرت معاذ کی رائے یہ تھی کہ زمین کے بڑے بڑے رقبوں کا چند افراد کے ہاتھوں میں آجانا برا ہے۔ اس سے آئندہ آنے والوں کی حق تلفی اور ہمت شکنی ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ان دلائل کو وزن دینا اور ان کی روشنی میں ایک اہم فیصلہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کے نزدیک سماج کو دولت کے ارتکاز سے بچانا اسلام کی معاشی پالیسی کا ایک رہنما اصول ہے۔

فے کے مال کی تقسیم کے بارے میں ابتداءً حضرت عمرؓ نے بھی مساوی تقسیم کی اسی پالیسی پر عمل کیا جو حضرت ابوبکر نے اختیار کی تھی[2] لیکن ۱۶ھ میں جب عراق و شام کی فتح سے مال خمس اور فے کے طور پر حاصل ہوا تو آپ نے اپنی پالیسی تبدیل کر دی۔ آپ نے اسلام لانے میں سبقت کرنے والوں کو اور اسلام کی نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو عام افراد سے زیادہ حصے دیئے۔ جن افراد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

---

[1] ابوعبید۔ کتاب الاموال ص ۵۹۔ نیز ملاحظہ ہو بلاذری : فتوح البلدان ص ۱۵۱

[2] ابو یوسف : کتاب الخراج ص ۲۹

مکہ میں طرح طرح کے مصیبتیں جھیلی تھیں، اسلام کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کی تھی اور مدینہ کے ابتدائی دور میں آپ کے ساتھ مل کر کفار سے جنگیں کی تھیں اُن کو آپ نے بعد میں ایمان لانے والوں سے زیادہ حصوں کا مستحق قرار دیا۔ تقسیمِ فَے میں مساوی سلوک کی جگہ ترجیحی سلوک کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ آپ کو یہ کسی طرح گوارا نہ تھا کہ جن لوگوں نے اسلام میں داخل ہونے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگیں لڑی تھیں ان کو ان لوگوں کے برابر کے حصے دیئے جائیں جنھوں نے ابتدا ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ بشانہ کفار سے جنگ کی تھی۔

قال: لا اجعل من قاتل رسول الله صلی الله علیه وسلم کمن قاتل معه[1]

آپ نے فرمایا: جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کی تھی ان کو میں تقسیمِ فَے میں، اُن کے برابر نہیں کر سکتا جنھوں نے آپ کے ساتھ ہو کر جنگ کی تھی۔

اس نئے طریقِ کار کے حق میں جو سیاسی، معاشرتی، نفسیاتی اور دینی دلائل دیئے جا سکتے ہیں وہ واضح ہیں۔ لیکن معاشی طور پر اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ سماج کے اندر تقسیمِ دولت میں مزید ناہمواری پیدا ہو۔ چنانچہ آٹھ سال[2] تک اس پالیسی پر عمل کرنے کے بعد اپنے دورِ خلافت کے آخری سال میں حضرت عمرؓ نے اپنی رائے پھر تبدیل کی اور آئندہ تقسیمِ فَے میں مساوات برتنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

حدثنا عبد الرحمٰن بن مهدی عن هشام بن سعد عن زید بن اسلم عن ابیه قال: سمعت عمر یقول: لئن عشت الی هذا العام المقبل لألحقن آخر الناس باولهم حتی یکونوا بَیّاناً واحداً:

ہم سے عبدالرحمٰن بن مہدی نے انہوں نے ہشام بن سعد سے انہوں نے زید بن اسلم سے اور انھوں نے اپنے والد سے روایت کرتے ہوئے حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے عمرؓ کو یہ کہتے سُنا ہے کہ اگر میں آئندہ سال اس وقت تک زندہ رہا تو تقسیمِ فَے میں، آخر کے لوگوں کو سرِ فہرست لوگوں سے ملا دوں گا تاکہ سب مساوی ہو جائیں۔

[1] ابو یوسف: کتاب الخراج ص ۵۰

[2] سنہ ۱۶ھ تا سنہ ۲۳ھ

[قال عبدالرحمٰن: تبأنا واحدًا شيئًا واحدًا][1]

[عبدالرحمٰن نے کہا: تبأناً واحداً کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہی جیسے ہو جائیں]

اسی روایت کو ابن سعد نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:-

"سمعت عمر بن الخطاب يقول: والله لئن بقيت الى هذا العام المقبل لالحقن اخر الناس باولهم ولاجعلنهم رجلا واحدا[2]

میں نے عمر بن الخطاب کو یہ کہتے سنا ہے کہ "خدا کی قسم اگر میں آئندہ سال اس موقعہ تک زندہ رہا تو آخر لوگوں کو شروع کے لوگوں سے ملا دوں گا اور ان سب کو ایک جیسا کر دوں گا۔

... عن زيد بن اسلم عن ابيه انه سمع عمر بن الخطاب قال: لئن بقيت الى الحول لالحقن اسفل الناس باعلاهم[3]

زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عمر بن الخطاب کو یہ کہتے سنا ہے کہ: اگر میں ایک سال اور زندہ رہا تو وظیفے میں حصے کے اعتبار سے سب سے نیچے کے لوگوں کو سب سے اوپر کے لوگوں کے مساوی کر دوں گا۔

ولما رای المال قد كثر قال: "لئن عشت الى هذه الليلة من قابل لالحقن اخر الناس باولهم حتى يكونوا في العطاء سواء۔ قال فتوفي رحمه الله قبل ذالك[4]

(راوی کہتا ہے کہ) جب آپ نے دیکھا کہ (دفتر کا) مال بہت زیادہ آنے لگا ہے تو فرمایا "اگر میں آئندہ سال اس شب زندہ رہا تو (رجسٹر میں درج) آخر کے لوگوں کو شروع کے لوگوں سے ملا دوں گا تاکہ سارے لوگوں کو برابر برابر وظیفے ملنے لگیں" (راوی نے کہا کہ) آپ اس سے پہلے ہی انتقال فرما گئے اللہ آپ پر رحم فرمائے۔

---

۱ ابو عبید: کتاب الاموال ص ۴-۲۶۳ -

۲ محمد ابن سعد: الطبقات الکبریٰ طبع بیروت جلد ۳ ص ۳۰۱ -

۳ ایضاً ایضاً

۴ ابو یوسف کتاب الخراج ص ۵۵

ان روایات سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ نے تقسیم فے میں عدم مساوات برتنے کی پالیسی سے رجوع کر کے مساوات برتنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن یہ واضح نہ ہو سکا کہ آپ نے یہ فیصلہ کس وجہ سے کیا تھا۔ کتاب الخراج کی مذکورہ بالا روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مال فے کی کثرت اس نئے فیصلہ کا سبب بنی تھی لیکن ہمیں یہ توجیہ کافی نظر نہیں آتی۔ سابقین اولین اور اسلام کی نمایاں خدمات انجام دینے والوں کا امتیاز برقرار رکھنے کا جو مقصد حضرت عمرؓ کے سامنے تھا وہ اسی وقت پورا ہو سکتا تھا جب مال فے کی کثرت کے باوجود، ان افراد کے حصے دوسرے افراد سے زیادہ رکھے جاتے، صرف مالِ فے کی کثرت اس بات کے لیے کافی نہیں کہ ان کے امتیازی مقام کو نظر انداز کر دیا جائے، یہ بھی ممکن تھا کہ سب کے حصوں میں اضافہ کر دیا جاتا اور منتخب لوگ پھر بھی دوسروں سے زیادہ حصہ پاتے، نئے فیصلہ کے لیے ضروری ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے کوئی ایسی مصلحت ہو جس کو وہ ان مصالح پر ترجیح دینے لگے ہوں جو امتیازی سلوک اور غیر مساوی تقسیم کے فیصلے کے وقت ان کے سامنے تھے اور گیارہ سال تک برابر سامنے رہے۔

ہمارے نزدیک یہ نئی مصلحت ان مفاسد کے ازالہ کی ضرورت تھی جو سماج کے اندر تقسیم دولت میں بڑھتے ہوئے تفاوت سے پیدا ہو رہے تھے، یا آئندہ پیدا ہو سکتے تھے۔ جن لوگوں کو دوسروں سے زیادہ حصے مل رہے تھے ان کے اندر معیارِ زندگی کو حدِ اعتدال سے زیادہ بلند کرنے، جائدادیں خریدنے اور جہاد فی سبیل اللہ کی طرف سے قدرے غافل ہو جانے کے رجحانات پیدا ہوتے دیکھ کر آپ کی بصیرت نے یہ پہچان لیا ہو گا کہ ان رجحانات کو غیر مساوی تقسیم فے سے مزید تقویت حاصل ہو گی دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ گیارہ سال تک امتیازی سلوک کرنے کے بعد اب آپ کے نزدیک اس طریقہ کو باقی رکھنا اتنا ضروری نہ رہ گیا ہو۔ کیونکہ جن افراد کو آپ ممتاز کرنا چاہتے تھے ان کو اس طویل عرصہ میں خاصہ موقعہ مل چکا تھا۔

نئے فیصلہ کے مطابق جن لوگوں کو پہلے زیادہ حصہ مل رہا تھا ان کے حصہ میں کمی نہیں ہوتی بلکہ جو لوگ پہلے کم حصہ پاتے تھے ان کے حصہ میں اتنا اضافہ پیشِ نظر تھا کہ سب کے حصے برابر ہو جائیں ایسا

کرنا اسی وجہ سے ممکن ہوسکا تھا کہ فے کا مال اب پہلے سے زیادہ تھا۔ کتاب الخراج کی مذکورہ بالا توجیہ ہمارے نزدیک فیصلہ کے صرف اسی پہلو پر منطبق ہوتی ہے۔

لیکن ایک دوسری روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا ارادہ تھا کہ امیر لوگوں کی فاضل دولت لیکر غریبوں کے درمیان تقسیم کردیں۔

عن ابی وائل قال قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ لو استقبلت من امری ما استدبرت لاخذت فضول اموال الاغنیاء فقسمتها علی فقراء المهاجرین [1]	ابو وائل سے مروی ہے کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: جو امور میں پہلے طے کرچکا اگر انہیں مجھے آئندہ بھی طے کرنے کا موقع ملتا تو میں امیروں سے ان کی فاضل دولت لے کر اسے فقرائے مہاجرین کے درمیان تقسیم کردیتا۔

اپنے دورِ خلافت کے آخری برس میں حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ آپ سماج میں دولت کی تقسیم میں بڑھتی ہوئی ناہمواری سے پریشان رہنے لگے تھے، اور اس صورتِ حال کی روشنی میں اپنے بعض گزشتہ فیصلوں پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کرتے تھے اور ایک راست اقدام کے ذریعہ تقسیمِ دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ روایت ہماری اس رائے کی بھی تائید کرتی ہے کہ تقسیمِ فے کے بارے میں حضرت عمرؓ کے نئے فیصلے کی اصل وجہ گذشتہ پالیسی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ناہمواری اور بڑھتی ہوئی عدمِ مساوات تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اموالِ فے کی تقسیم میں مساوات کی پالیسی پر عمل نہیں کیا۔ مزید برآں آپ نے عراق و شام کی زمینوں کو، جن کا مالیہ اب تک ریاست براہِ راست کاشتکاروں سے وصول کرتی تھی، متعینہ خراج پر درمیانی افراد کو دینے کا طریقہ اختیار کیا۔ یہ افراد کاشتکاروں اور ریاست

---

[1] طبری: تاریخ ص ۲۷۷۴ (حوادث ۲۳ھ) اور ابن حزم المحلی جلد ۶ ص ۱۵۸۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ اس روایت کی سند بہت صحیح اور پختہ ہے۔

کے درمیان آگئے، ریاست کو متعینہ رقم ادا کرتے اور کاشت کاروں سے مختلف شرحوں کے مطابق لگان وصول کرتے یا پیداوار میں شریک ہو جاتے اور اس طرح خود نفع کماتے۔ اسی چیز نے آگے چل کر زمینداری اور جاگیرداری کی شکل اختیار کر لی جس سے گوناگوں مفاسد رونما ہوئے۔ ابتداءً یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا تھا کہ ریاست کو مالیہ وصول کرنے میں سہولت ہو اور وہ ان انتظامی زحمتوں سے بچ سکے جو لاکھوں چھوٹے چھوٹے کاشت کاروں سے مالیہ وصول کرنے میں اسے اٹھانی پڑتی تھی اس طریقہ کو اختیار کرنے سے ریاست کی آمدنی بھی بڑھ گئی تھی لیکن یہ درمیانی افراد کاشت کاروں پہ زیادہ بار ڈالنے لگے اور اپنا نفع بڑھانے لگے۔

مقررہ سالانہ وظائف کے علاوہ حضرت عثمانؓ نے متعدد افراد کو ان کی خدمات کی بناء پر فراخ دلی کے ساتھ مزید رقمیں بھی عطا کیں۔ پھر مروان بن حکم کے بعض تصرفات کے نتیجہ میں ایک خاص طبقہ ــ بنوامیہ ــ کو بیش از بیش مالی فوائد حاصل ہونے لگے۔

ان پالیسیوں کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ کے اندر تقسیم دولت میں پایا جانے والا تفاوت بہت بڑھ گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس پالیسی پر اعتراض تھا۔ آپ فَے کی تقسیم کے بارے میں وہی رائے رکھتے تھے جو حضرت ابوبکرؓ کی تھی[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت اضطراب کے عالم میں گزرا اور اس کے بعد سلاطینِ بنوامیہ نے نہ صرف یہ کہ معاشرہ میں دولت اور آمدنی کی تقسیم میں بڑھتی ہوئی ناہمواری کو کم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ ان کی پالیسی کے نتیجہ میں یہ تفاوت بڑھتا گیا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے اور آپ نے زندگی کے مختلف شعبوں کو حقیقی اسلام کے مطابق از سرِ نو منظم کرنے کی کوشش کی تو معاشی نظام میں بھی متعدد اصلاحات عمل میں لائی گئیں۔ بے جا طریقہ پر دی ہوئی جاگیریں واپس لے کر ان کے اصلی مالکوں کو دی گئیں۔ جن سرکاری زمینوں کو لوگوں نے ذاتی ملکیت بنا لیا تھا ان کی سابق حیثیت بحال کی گئی اور آئندہ کے لیے ایسی زمینوں کی خرید و فروخت ممنوع قرار دے دی گئی۔ لعد میں

[1] ابو عبید: کتاب الاموال ص ۲۶۴

آنے والے حکمرانوں نے ان اصلاحات کو ترک کر دیا اور حکومت کی معاشی پالیسی میں دوبارہ اسلام کے اصولوں سے انحراف کی مختلف شکلیں نمودار ہونے لگیں۔

ہمیں اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کا صحیح مفہوم وہ ہے جو خلافتِ راشدہ کے عمل سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسلام کسی فرد پر دولت کے کسب کے سلسلہ میں کوئی اصولی اور دائمی پابندی نہیں عائد کرتا لیکن اسے یہ بات پسند نہیں کہ دولت سماج کے ایک طبقہ میں مرکوز ہو کر رہ جائے۔ قرآن، سنتِ نبوی اور خلافتِ راشدہ کے نظائر کی روشنی میں ہم اطمینان کے ساتھ یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ دولت اور آمدنی کی تقسیم کے اندر تفاوت کو کم کرنا اسلام کی معاشی پالیسی کا ایک رہنما اصول ہے۔

اس رائے کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اسلام کو معاشرہ میں عیش پرستوں اور مترفین کے طبقہ کا ظہور سخت ناپسند ہے۔ ہم اس کتاب کے پہلے باب میں یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کریم کے فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں کسی معاشرہ میں عیش کوشی اور عیش پرستی کرنے والے طبقہ کا ظہور اور غلبہ اس معاشرہ کی ہلاکت اور بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ تقسیم دولت میں بڑھتا ہوا تفاوت اس طبقہ کے ظہور کے لیے راہیں ہموار کرتا ہے۔ اس بنا پر بھی یہ ضروری ہے کہ اسلامی ریاست اس بات کا اہتمام کرے کہ دولت اور آمدنی کی تقسیم میں روزافزوں تفاوت کا رجحان نہ جڑ پکڑ سکے۔

رسائل و مسائل

احادیث کی تاویل کا صحیح طریقہ

سوال : ابو زید صاحب اصلاحی کا ایک مضمون ماہ جولائی ۶۲ء کے فاران میں شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "ضمیر کی اصلاح اور درستی"۔ اس مضمون میں ذیل کی حدیث نقل ہوئی ہے۔ حدیث یہ ہے "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تم لوگوں نے گناہ نہ کیا تو تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ اٹھا لے گا اور ایک دوسری قوم لے آئیگا جو گناہ کرے گی اور مغفرت چاہے گی۔ پس اللہ اس کو بخش دے گا"۔

ہم سب جانتے ہیں کہ عوام کے ذہنوں میں گناہ کا تصور صرف کبائر ہی کا ہے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ گناہ کے معنی ہیں زنا اور اس کی قبیل اور جھوٹ، چوری۔ اگر سوسائٹی کسی قدر معیاری ہو تو غیبت کو بھی کبھی کبھار گناہ سمجھا جاتا ہے۔ ورنہ نماز نہ پڑھنا، روزہ نہ رکھنا، زکوٰۃ ادا نہ کرنا، استطاعت پر حج نہ کرنا، کسی کا مذاق اڑانا، کسی کو بُرے ناموں سے پکارنا، بعض مرتبہ رشوت بھی لے لینا، سُود لینا اور سود دینا، لذتِ نفس کے لیے ایک دوسرے کی مذاقاً غیبت کر لینا، سینما دیکھنا، غضِّ بصر نہ کرنا، عورتوں کا بے پردہ گھومنا اور اسی طرح کئی حدود پھلانگنا بھی گناہ نہیں ہیں۔ صغائر کو چھوڑ ہی دیجیے۔

ان حالات کے تحت اگر یہ حدیث عوام پڑھیں تو کیا ان میں کا بیشتر طبقہ اس بات پر خوش نہ ہو گا کہ وہ تو گناہ کر ہی نہیں رہے ہیں، اگر وہ اس وعید والی حدیث پر عمل نہ کریں تو یقیناً وہ تباہی کا شکار ہو جائیں گے۔ یعنی وہ صرف اپنے پروردگار کی خوشنودی کی خاطر یا تباہی سے بچنے کے لیے زنا، چوری، جھوٹ وغیرہ قسم کے گناہوں کا (جن کو ہی وہ گناہ سمجھتے ہیں) ارتکاب اور اس کے بعد توبہ اپنے اوپر لازمی قرار دیں گے۔ یا اگر

چند افراد میں دینی حس پیدا ہو گئی ہو تو وہ یہ خیال کرنے لگیں گے کہ جو لوگ ابتداءِ عمر ہی سے بہت کم کبائر میں مبتلا ہوئے ہوں، وہ قوم کے لیے نقصان دہ ہوں گے۔ انہیں گناہ کرنا لازمی ہوگا اور اس کے بعد توبہ۔ یا بعض ہمدردانِ قوم جب یہ دیکھیں گے کہ ان کی اولاد گناہوں میں ہی مبتلا ہو رہی ہے تو وہ صرف اس لیے انجان ہو جائیں گے کہ اس میں قوم کی بھلائی ہے اور انہیں بعد میں توبہ کی توفیق مل جائے گی۔ یہ توبہ اور استغفار کا طریقہ سچ مچ ایک حکمت ہوتا تو اسلاف ضرور تعاونوا علی الاثم والعدوان کی نصیحت اپنی اولاد کو کرتے تاکہ ایسا نہ ہو کہ نیکیوں کی کثرت کی وجہ سے وہ اٹھا لیے جاتے اور ان کے بجائے گنہگار قومیں چینی، تاتاری اور حبشی وغیرہ آ جاتے۔

ناچیز کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا حدیث دین کی غربت کے دور میں بنائی گئی ہوگی۔ اس غربت کے دور میں جب احادیث پر عمل نہیں ہوتا تھا بلکہ اپنے اعمال کی تائید میں احادیث کا REFERENCE دیا جاتا تھا۔ یا واقدی اور ان جیسے دوسرے لوگ، اپنے نفس کو مطمئن کرنے کے لیے یا خلفاء وقت، امراء، اور سلاطین کو خوش کرنے کے لیے ایسی احادیث گھڑا کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں استغفار کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے لیکن حقیقی اہمیت استغفار کی ہے اس سے کہیں زیادہ گناہ پر آمادہ کیا گیا ہے۔ میرا جہاں تک مشورہ ہے۔ تو ایسی احادیث کو حدیثوں کی کتابوں سے بالکل نکال دیا جائے یا عوام کے سامنے پیش ہی نہ کیا جائے۔

جواب:- کسی حدیث کو رد کرنے کا یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ آدمی اس کے مضمون پر تھوڑا سا غور کرے اور اگر بات سمجھ میں نہ آئے، یا اس کا کوئی غلط مفہوم ذہن میں پیدا ہو جائے تو بے تکلف یہ فیصلہ کر دے کہ حدیث گھڑی ہوئی ہے اور ایک نظریہ یہ بھی ساتھ ساتھ قائم کرے کہ فلاں فلاں وجوہ سے یہ گھڑی گئی ہوگی۔ اس طریقے سے احادیث پرکھی جانے لگیں تو نہ معلوم کتنی صحیح حدیثوں کو دریا برد کر ڈالا جائے گا۔ حدیثوں کو پرکھنے کے لیے علم حدیث کی گہری واقفیت ضروری ہے

اور اس کے بعد دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی میں بات کے مغز کو پہنچنے کی عمدہ صلاحیت ہو۔ اس طرح جب روایت اور درایت میں صحیح توازن قائم ہو جائے تب۔ انسان اس قابل ہو سکتا ہے کہ احادیث کو جانچ کر ان کی صحت و سقم اور ان کے مضمون کی معنوی حیثیت کے متعلق کوئی رائے قائم کرے۔

جس حدیث کے متعلق آپ نے تنقید کی ہے وہ مسلم، ترمذی اور مسند احمد میں متعدد طریقوں سے منقول ہوئی ہے اور روایت کے اعتبار سے اس پر کوئی وزنی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ رہا اس کا مضمون، تو اس موضوع سے متعلق جو دوسری احادیث وارد ہوئی ہیں ان سب کے ساتھ ملا کر اسے پڑھا جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ آدمی کو جان جان کر گناہ کرنا چاہیے اور پھر توبہ کرنی چاہیے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ انسان جب تک انسان ہے بالکل بے خطا اور بے گناہ نہیں ہو سکتا۔ انسان کی اصل خوبی یہ نہیں ہے کہ اس سے کبھی گناہ سرزد ہی نہ ہو، بلکہ اس کی اصل خوبی یہ ہے کہ جب بھی اس سے گناہ سرزد ہو جائے، وہ نادم ہو اور اپنے خدا سے معافی مانگے۔ اس مضمون کو ذہن نشین کرنے کے لیے حضورؐ نے فرمایا کہ اگر اللہ کو بے گناہ مخلوق ہی پیدا کرنی ہوتی تو انسانوں کے بجائے کوئی اور مخلوق پیدا کرتا۔ انسان کو تو خدا نے نیکی اور گناہ دونوں کی صلاحیت و استعداد کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اور اس نوعیت کی مخلوق سے بے گناہی مطلوب نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے تو بڑے سے بڑا مقام یہی ہو سکتا ہے کہ تقاضائے بشریت جب بھی اس سے قصور سرزد ہو، اس پر اصرار نہ کرے بلکہ نادم ہو کر استغفار کرے۔

(بقیہ اشارات)

دوسرے عجائبات میں یہ بھی ایک عجوبہ ہے کہ جو لوگ کفار مکہ کے مظالم کا سب سے زیادہ نشانہ بنتے تھے، جنہیں انگاروں کے بستر پر سونا پڑتا تھا یعنی حضرت بلالؓ، عمارؓ، یاسرؓ وغیرہ ان میں سے کسی کا نام مہاجرین حبشہ کی فہرست میں نہیں آتا۔ اس چیز کو دیکھتے ہوئے ایک مغربی مورخ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ مظالم کی یہ ساری داستانیں محض افسانہ ہیں۔ لیکن اُسے کیا معلوم کہ عشق کی آگ تکلیف دینے کی بجائے مصیبتوں، کلفتوں اور تمام آلامِ حیات کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے اور جو دل ایک مرتبہ اس درد سے لذت آشنا ہو جاتا ہے وہ اس لطف کو کبھی بھی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

ترجمان القرآن کا منصبِ رسالت نمبر

جس میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے منکرینِ حدیث کے تمام دلائل کا مُنہ توڑ اور مسکت جواب دیا ہے۔ اس ضخیم نمبر کے چند پرچے دفتر میں باقی رہ گئے ہیں۔
ضرورت مند اصحاب فوری توجہ فرمائیں۔ قیمت فی پرچہ تین روپے ۵۰ پیسے
دو سے زائد پرچوں کے خریدار کو ۲۵ فیصد رعایت

منیجر ترجمان القرآن

خریداران ترجمان القرآن، ترسیل زر اور خط و کتابت کرتے وقت اپنے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا کریں اور اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھیں ورنہ عدم تعمیل کی ذمہ داری دفتر پر عائد نہ ہوگی۔

مینجر

(بقیہ: سعودی عرب میں سوشل اصلاحات)

یہ ادارے اگر کسی شخص کو عدم استحقاق کی بنا پر داخل کرنے سے انکار کردیں گے تو وہ شخص گزارہ الاؤنس سے بھی محروم ہوگا۔

فصل دوم : گزارہ الاؤنس کی مقدار

دفعہ ۷ : ہر مستحق یتیم کو کم ازکم ۳۶۰ ریال سالانہ گزارہ الاؤنس دیا جائے گا۔ البتہ اگر چند یتیم سگے بھائی ہوں اور وہ مشترک زندگی بسر کرتے ہوں تو ۵ تک کی تعداد میں انہیں ۵ کا الاؤنس دیا جائے گا اور ۵ سے متجاوز ہونے کی صورت میں بھی زیادہ سے زیادہ ۵ کا الاؤنس مل سکے گا۔ یتیم کے تنہا ہونے کی صورت میں اُسے ملک کے کسی رفاہ خانے میں داخل کیا جائے گا۔

دفعہ ۸ : مستقل معذور کا گزارہ الاؤنس کم ازکم ۳۶۰ ریال سالانہ ہوگا۔ اور اگر وہ شادی شدہ ہوگا تو اُسے ہر بیوی کے لیے (صرف دو بیویوں کی حد تک) اور ۱۸ سال تک کے ہر بچے کے لیے (صرف چار بچوں کی حد تک)، مزید اضافی الاؤنس دیا جائے گا جس کی کم ازکم مقدار ۱۲۰ ریال فی کس سالانہ ہوگی۔ "معاشرتی تحفظ" کا محکمہ (جو عنقریب وجود میں لایا جائے گا) تنہا معذور افراد کو ایسے رفاہ خانوں میں داخل کرے گا جو پہلے سے ملک میں قائم ہیں یا جو آئندہ اس غرض کے لیے قائم کیے جائیں گے۔

دفعہ ۹ : لاوارث عورت کم ازکم ۳۶۰ ریال سالانہ کی مستحق ہوگی۔ اور صاحبِ اولاد ہونے کی صورت میں اُسے چار بچوں کی حد تک ہر اُس بچے کی طرف سے، جس کی عمر ۱۸ سال سے کم ہوگی اور اُس کے سوا کوئی دوسرا شخص اُس کا کفیل نہ ہوگا، اضافی گزارہ الاؤنس دیا جائے گا جس کی کم ازکم مقدار ۱۲۰ ریال سالانہ ہوگی۔ معاشرتی تحفظ کا محکمہ بے اولاد لاوارث عورت کو کسی بھی کفالت گھر میں داخل کرنے کا مجاز ہوگا۔

دفعہ ۱۰ : گزارہ الاؤنس کا تخمینہ لگاتے وقت ہر مستحق کے ماحول و مصارف اور اس کے شہر اور بستی کے اقتصادی احوال کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔

دفعہ ۱۱ : اگر کسی مستحق کو کسی نوعیت کی مستقل آمدنی ملتی ہوگی تو اس کے گزارہ الاؤنس میں سے

اس آمدنی کے مقدار رقم ساقط کر دی جائے گی۔

فصل سوم: گزارہ الاؤنس کے حصول کا طریقہ

دفعہ ۱۲: امیدوار گزارہ الاؤنس کی درخواست وزارتِ محنت و معاشرتی بہبود کے دفتر میں دے گا جو "گزارہ الاؤنس فارم" کی صورت میں ہوگی۔ اُسے اپنا استحقاق ثابت کرنے کے لیے اپنے علاقہ کے قاضی (مجسٹریٹ) سے تصدیقی شہادتیں فراہم کرنا ہوں گی۔

دفعہ ۱۳: "معاشرتی تحفظ" کا محکمہ (جو وزارتِ محنت و معاشرتی بہبود کے تحت قائم کیا جائے گا) اس امر کا پابند ہوگا کہ وہ امیدوار کو زیادہ سے زیادہ ۳ ماہ کے اندر درخواست پر اپنے فیصلہ سے آگاہ کرے۔ محکمہ کی طرف سے عدم استحقاق کا فیصلہ صادر ہونے کی صورت میں امیدوار وزیرِ محنت و معاشرتی بہبود سے نالش کر سکتا ہے۔ اور وزیر کو اس بارے میں کلی اختیار حاصل ہے۔

دفعہ ۱۴: درخواست کی منظوری کی صورت میں مستحق کو محکمہ کی طرف سے ایک کارڈ جاری کیا جائے گا جس کی رُو سے اُسے سالانہ چار قسطوں میں گزارہ الاؤنس ملا کرے گا۔

دفعہ ۱۵: مستحق ہر سال ماہ رجب کے نصف اوّل میں محکمہ معاشرتی تحفظ" کو اپنے مالی اور گھریلو حالات سے آگاہ کرتا رہے گا۔ اور اس کے وفات پا جانے کی صورت میں متعلقہ علاقہ کا نگران وزارتِ محنت و معاشرتی بہبود کو اس کی فوتیدگی کی اطلاع دے گا۔

دفعہ ۱۶: اگر یہ ثابت ہو گیا کہ کسی امیدوار نے غلط بیانات کے ذریعہ سے گزارہ الاؤنس کی منظوری حاصل کی ہے یا استحقاق سے زیادہ رقم وصول کی ہے تو متعلقہ محکمہ اُسے الاؤنس سے کلی یا جزئی طور پر محروم کر سکتا ہے اور وصول کردہ رقم کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

فصل چہارم: سوشل ایڈ

دفعہ ۱۷: "معاشرتی تحفظ" کا ادارہ (مذکورہ بالا گزارہ الاؤنس کے علاوہ) متعینہ مدات کے اندر ایسے حاجت مند افراد اور خاندانوں کو بھی، نقدی کی صورت میں یا اشیائے ضرورت کی صورت میں، امداد دے گا جن پر گزارہ الاؤنس کا قانون منطبق نہیں ہو سکتا۔ یہ امداد آتشزدگی، سیلاب

اور قحط اور اس نوعیت کے دوسرے حادثات میں دی جائے گی یا ان حالات کے تحت دی جائے گی جو وزیر محنت و معاشرتی بہبود کی نگاہ میں قابلِ امداد قرار پائیں گے۔ "معاشرتی تحفظ" کا ادارہ ایسی امداد کے مستحق شخص کو معاشرتی بہبود کے کسی اور ادارے کے سپرد بھی کر سکتا ہے۔

دفعہ ۱۸ : مستحق یا مصیبت زدہ شخص اپنی درخواست وزیر محنت و معاشرتی بہبود کے دفتر کو ایک مطبوعہ فارم پر پیش کرے گا اور اُسے اپنے استحقاق کے ثبوت کے لیے اپنے علاقہ کے قاضی کا تصدیقی سرٹیفکیٹ مہیا کرنا لازم ہوگا۔ ہنگامی حالات میں وہ اس کارروائی کا پابند نہیں ہوگا۔

دفعہ ۱۹ : "معاشرتی تحفظ" کے ادارہ پر لازم ہوگا کہ وہ درخواست گزار کو تین ماہ کے اندر اندر اپنے فیصلہ سے آگاہ کرے۔ ہنگامی حالات میں یہ ادارہ ایسی درخواست پر زیادہ سے زیادہ ۴۸ گھنٹے کے اندر اپنا فیصلہ صادر کرنے کا پابند ہوگا۔

باب دوم : ادارۂ معاشرتی تحفظ

دفعہ ۲۰ و ۲۱ و ۲۲ : وزارتِ محنت و معاشرتی بہبود کے تحت "معاشرتی تحفظ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جائے گا جو پوری مملکت کے اندر اپنی زیادہ سے زیادہ شاخیں قائم کریگا۔ مذکورۂ بالا قوانین کی تنفیذ کی ذمہ داری اسی ادارہ پر عائد ہوگی۔ اس ادارے کے پاس ایسے تمام اشخاص کی معلومات ہوں گی جو سرکاری طور پر یا غیر سرکاری طور پر امداد حاصل کر رہے ہیں۔ ادارۂ تحفظ معاشرتی کے قیام و توسیع کے مراحل طے ہونے تک ان قوانین کو وزارتِ محنت و معاشرتی بہبود اپنے ماتحت اداروں اور شاخوں کے ذریعہ سے روبعمل لائے گی۔

باب سوم :

دفعہ ۲۳ : وہ تمام قوانین منسوخ سمجھے جائیں گے جو مذکورۂ بالا قوانین سے متصادم ہوں گے۔ وزیر محنت و معاشرتی بہبود اپنے احکام و اوامر کے ذریعہ سے ان قوانین کو "ادارہ تحفظِ معاشرت" کی بااختیار کمیٹی کے مشورہ سے ان قوانین کے سرکاری گزٹ میں شائع ہو جانے کی تاریخ سے نافذ العمل کرے گا۔

ادارۂ معاشرتی تحفظ کا نظام

دفعہ ۱ : قوانین مذکورہ کے بموجب ایک فاؤنڈیشن وجود میں لایا جائے گا جو وزارتِ محنت و معاشرتی بہبود کے تابع ہوگا اور جسے "معاشرتی تحفظ" کا ادارہ کہا جائے گا اس ادارے کا مرکز ریاض میں ہوگا اور یہ ایک مستقل بالذات ادارہ ہوگا۔

دفعہ ۲ : اس ادارے کے اغراض و مقاصد درج ذیل ہیں :

الف : مملکت کے اندر معاشرتی تحفظات کی منصوبہ بندی کرنا۔

ب ۔ ایسی ہر نوع کی جدوجہد کرنا جس سے سعودی معاشرے میں معاشرتی تحفظات کے مقاصد کی خدمت سرانجام پائے۔ ان میں منجملہ دوسرے مقاصد کے یہ مقاصد بھی شامل ہیں کہ ملک کے اندر ایسے مراکز و مدارس قائم کیے جائیں جن میں معذور افراد کو ٹریننگ دے کر کارآمد بنایا جا سکے نیز ایسے ادارے جو یتامیٰ اور ضعفاء اور سن رسیدہ لوگوں کی تعلیم و تربیت اور پرورش و نگرانی کی خدمت انجام دیں۔

ج : ایسے پیداآور منصوبے تجویز کیے جائیں اور انہیں نافذ کیا جائے جو ادارہ کی آمدنی میں اضافہ کا بھی موجب ہوں اور سعودی باشندوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو برسرِ روزگار کیا جا سکے۔

دفعہ ۳ : ادارۂ معاشرتی تحفظ کے مالی ذرائع :

الف : اموالِ زکوٰۃ (تحصیل زکوٰۃ کے تمام ادارے زکوٰۃ کی رقوم وصول کر کے ادارۂ معاشرتی تحفظ کی تحویل میں دیں گے)،

ج ۔ ریاست کے خزانہ میں سے متعین رقوم

د ۔ ادارۂ معاشرتی تحفظ کے تابع اموال و اراضی کی پیداوار۔

ادارہ کا تمام سرمایہ مملکت کے بنک میں جمع ہوگا اور صرف اتنی رقوم خازن اپنے پاس رکھ سکے گا جو مصارفِ عاجلہ کے لیے ناگزیر ہوں گی۔

دفعہ ۴ : اس ادارے کا نظم و نسق ایک مجلس کے سپرد ہوگا جو افرادِ ذیل سے تشکیل دی جائے گی :

۱- وزیر محنت و معاشرتی بہبود (یا عدم موجودگی کی صورت میں اُس کا کوئی نمائندہ)

۲- وزارتِ مالیات کا سکرٹری

۳- وزارتِ محنت و معاشرتی بہبود کا سکرٹری

۴- ادارہ معاشرتی تحفظ کا ڈائرکٹر جنرل

۵- ۵ غیر سرکاری رکن، جو کابینہ کی جانب سے نامزد کیے جائیں گے۔ یہ نامزدگی ۳ سال تک ہو گی۔

تشریحی نوٹ: اس امر میں دو رائیں نہیں ہیں کہ شہریوں کی بنیادی ضروریات فراہم کرنا ریاست کے اوّلین مقاصد میں سے ہے۔ اسی بنا پر ریاست سعودیہ نے اس مقصد کو بہتر اور مفید ترین طریقے سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے ایسے قوانین جاری کر دیے ہیں اور ایسے ادارے قائم کر دیئے ہیں جو جدید ترین وسائل کے ساتھ اسے بروئے کار لائیں گے۔ معاشرتی تحفظات صرف عصرِ حاضر اور تہذیبِ جدید کے مظاہر نہیں ہیں بلکہ یہ اسلام کے بنیادی اصول ہیں اور اسلامی ریاست میں اوّل روز ہی سے ان کا اہتمام کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: انا عائل من لا عائل له (میں اُس کا سرپرست ہوں جس کا کوئی سرپرست نہ ہو) اس ارشاد کے بموجب مسلمانوں کا امیر بے سہارا اور حاجت مند افراد کی ضروریات پورا کرنے کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ قرآن کریم میں متعدد آیات کے اندر مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دی گئی ہے اور مالداروں کے مال میں سائل اور نادار کو حصہ دار قرار دیا گیا ہے۔ اسی بنا پر جلالۃ الملک کی حکومت ہمیشہ سے اس امر کی خواہاں رہی ہے کہ وہ اپنے اس دینی اور تہذیبی فرض کو انجام دے۔ چنانچہ اس نے پیشتر ازیں اطرافِ مملکت میں کئی تنظیمات جاری کر رکھی ہیں۔ لیکن اب اُس نے یہ عزم کر لیا ہے کہ وہ اس کام کو منظم طریقے سے اور جدید ترین وسائل کے ساتھ پورا کرے گی۔

دین کی خدمت کرنے والوں کیلئے ایک خصوصی رعایتی پیشکش

ہماری مختلف مطبوعات ایک عرصہ سے تبلیغی مقاصد کے لیے استعمال کی جارہی ہیں۔ یہ اپنے مقصد میں جس حد تک کامیاب ہیں اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ تبلیغی مقاصد کو بطور احسن انجام دینے کے لیے ہم نے اپنی چند چیدہ چیدہ کتب کا ایک سٹ بنایا ہے تاکہ جو حضرات بندگانِ خدا تک اسلام کی دعوت پہنچانا چاہتے ہیں ان کو ایسی تبلیغی کتابوں کا ایک ایسا جامع مجموعہ مل جائے جو ہلکا پھلکا اور کم قیمت ہو اور دعوتِ اسلام کے متعدد پہلوؤں پر حاوی بھی۔ ان سب باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے حسبِ ذیل (بیس) ۲۰ کتب پر مشتمل ایک سٹ بنایا گیا ہے:

۱۔ توحید و رسالت اور زندگی بعد موت کا عقلی ثبوت — ۱—۱۲
۲۔ سلامتی کا راستہ — ۰۰—۷۸
۳۔ اسلام اور جاہلیت — ۰۰—۸۷
۴۔ دینِ حق — ۰۰—۸۷
۵۔ اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر — ۰۰—۸۷
۶۔ تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں — ۱—۱۲
۷۔ بناؤ اور بگاڑ — ۰۰—۵۰
۸۔ جہاد فی سبیل اللہ — ۰۰—۴۱
۹۔ شہادتِ حق — ۰۰—۶۲
۱۰۔ مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل — ۰۰—۸۷
۱۱۔ اسلام کا نظامِ حیات — ۱—۰۰
۱۲۔ نیا نظامِ تعلیم — ۰۰—۳۷
۱۳۔ اسلامی نظامِ تعلیم — ۰۰—۶۲
۱۴۔ انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل — ۰۰—۶۲
۱۵۔ بیمۂ زندگی — ۰۰—۵۰
۱۶۔ مسئلہ قربانی — ۰۰—۵۰
۱۷۔ اسلام کا نظریۂ سیاسی — ۰۰—۶۲
۱۸۔ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟ — ۰۰—۵۵
۱۹۔ اپنی اصلاح آپ — ۰۰—۴۱
۲۰۔ ہدایات — ۰۰—۷۸

ان سب کتابوں کی مجموعی قیمت ۱۴ روپے ہوتی ہے لیکن ہم نے طے کیا ہے کہ رعایتی طور پر:

۱۔ اگر آپ ایک پورا سٹ خریدیں تو ۱۴ روپے کی بجائے ۱۱ روپے قیمت لی جائے گی۔

۲۔ اگر آپ ۵ سٹ مکمل خریدیں تو ۷۰ روپے کی بجائے صرف ۵۰ روپے میں مہیا کریں گے۔

۳۔ ڈاک خرچ و پیکنگ بذمہ خریدار ہوگا۔

ہمیں امید ہے کہ آپ نہ صرف خود اس رعایتی پیشکش سے فائدہ اٹھائیں گے بلکہ اپنے احباب کو بھی آمادہ کریں گے کہ اس موقع پر اس رعایتی پیش کش سے فائدہ اٹھائیں۔